

غالبیات

کے چند فراموش شدہ گوشے

ڈاکٹر اکبر حیدری

ادارۂ یادگار غالب کراچی

غالبیات

کے چند فراموش شدہ گوشے

ڈاکٹر اکبر حیدری

ادارۂ یادگارِ غالب
کراچی

سلسلہ مطبوعات ادارہ یادگار غالب

شمار : ۳۳

طبع اول	:	۲۰۰۲ء
صفحات	:	۳۸۰
طالع	:	احمد برادرز، ناظم آباد، کراچی
تعداد	:	پانچ سو
قیمت	:	دو سو روپے



فنی تدوین رفیق احمد نقشب



ادارہ یادگار غالب

پوسٹ بکس نمبر: ۳۲۶۸

ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰



غالب لائبریری

دوسری چورنگی، ناظم آباد

کراچی ۷۴۶۰۰

فہرست

۵	دیباچہ
۷	غالب اور شاہان اودھ
۳۶	غالب اور حسام الدین حیدر خان
۷۵	غالب، سالار جنگ اور ذکا
۹۵	غالب اور مفتی میر محمد عباس
۱۳۳	دیوان غالب نسخہ حمید یہ
	مخطوط دیوان غالب سری نگر
۱۵۱	اور مطبوعہ نسخے بیہیات غالب
۱۷۶	غالب کی تاریخ گوئی
۲۰۱	غالب کے آخری ایام
۲۲۱	غالب کا مزار
۲۲۵	غالب کی اولین شرح - وثوق صراحت
	ناصر علی سرہندی اور مرزا
۲۳۵	غالب کے متحد المعانی اشعار
۲۵۱	غالب کا ایک معترض - مرزا یاس یگانہ

حرفِ اوّل

اردو کے اہل تحقیق میں ڈاکٹر اکبر حیدریؒ کا کام معیار اور مقدار کے اعتبار سے مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ گزشتہ چار دہائیوں سے جس طرح اردو زبان و ادب کے مختلف گوشوں پر دہائی تحقیق دے رہے ہیں، اس کی مثالیں کم کم ملتی ہیں۔ ان کی شائع شدہ تصنیفات و مہمات کی تعداد ساٹھ سے زیادہ ہے اور علمی مقالات پانچ سو کے قریب ہیں۔ ان تصنیفات و مقالات میں جہاں ایک طرف قدیم مصنفین اور بیسویں صدی کے بعض اہم اہل قلم کی سوانحی تصنیفات فراہم کی گئی ہیں، وہیں دوسری طرف ان کے ایسے ادبی آثار کو بھی حصارف کرایا گیا ہے جو عام نگاہوں سے ابھل جاتے ہیں۔ میر خمیر، میر ظلیق، مرزا ابیر اور میر انیس کا بہت سا غیر مطلوب و حکام کیلکی مرتبہ ڈاکٹر حیدریؒ ہی کی کوششوں سے منظر عام پر آیا ہے۔ میر تقی میر کے دیوانِ اول کا ایک ایسا نسخہ انھوں نے دریافت کیا ہے جس کا متن حمد اول و دوم ان کے مقابلے پر مستند اور تعداد و اشعار زیادہ ہے۔ اسی طرح بہت سے اہم خطوط کی دریافت اور اشاعت سے انھوں نے ہماری ادبی تاریخ کے بہت سے گوشوں کو نور کیا ہے۔

پرانے اخبارات و رسائل بھی ڈاکٹر حیدریؒ کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ ان پر انھوں نے درجنوں مقالے لکھے کہ ان کے بارے میں معلومات عام کی ہیں۔ یہی نہیں ان میں شائع شدہ ایسے

☆ سابق استادِ علمیں یونیورسٹی، پٹنہ، ڈاکٹر حیدر آباد، دکن یونیورسٹی، پٹنہ، ڈاکٹر بھیر سنگھ سنگھ یونیورسٹی۔

بہت سے ادبی نواز اور کوہ پارہ شائع کیا ہے جن سے اہل ادب واقف نہیں تھے۔ ان نواہ کی اشاعت سے اردو کے علمی و ادبی سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

علامہ اقبال پر ڈاکٹر حیدری کا کام اس درجے کا ہے کہ اُن کا شمار ماہرینِ اقبالیات میں ہوتا ہے۔ اُن کی دو کتابیں ”اقبال اور صحتِ زبان“ اور ”کلامِ اقبال۔ ناولو ثایاب رسالوں میں“ اب تک کے اقبالیات کے تحقیقی کاموں پر اضافے کا درجہ رکھتی ہیں۔

غالب کے حوالے سے ڈاکٹر حیدری نے درجنوں مقالات لکھے ہیں جو مختلف علمی جریدوں میں نکھرے ہوئے ہیں یا تاحال غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کی افادیت کے پیش نظر ادارہ نیا دگار غالب کی طرف سے اُن سے گزارش کی گئی کہ وہ ان مقالات کو کتابی صورت نکھا کر دیں تو ان سے استفادے کا دائرہ وسیع ہوگا۔ اس گزارش کے جواب میں انہوں نے جو مضامین ارسال فرمائے، انہیں مندرجہ ذیل دو مجموعوں کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے:

(۱) نوا اور غالب

(۲) غالبیات کے چند فراموش شدہ گوشے

ان دونوں مجموعوں میں حیات و آثار غالب اور معاصرین و صحائفِ غالب کے بارے میں جو معلومات ملتی ہیں، وہ شاید ہی کسی دوسری جگہ دستیاب ہوں۔ امید ہے ان دونوں کتابوں کی اشاعت سے غالب پر مزید کام کرنے کی راہ ہموار ہوگی۔

مرزا غالب اور شاہانِ اودھ

مرزا غالب کے شاہانِ اودھ کے ساتھ خاندانی تعلقات تھے۔ ان کے والد عبداللہ خان بہادر ۱۰۵۰، نواب آصف اللہ اول بہادر (متوفی ۱۲۱۲ھ، مطابق ۱۷۹۷ء) کی سرکار سے وابستہ تھے۔ مرزا جب معززہ پنشن کے سلسلے میں دہلی سے کلکتے کے لیے روانہ ہو گئے تو راستے میں انھیں لکھنؤ میں گیارہ ماہ تک قیام کرنا پڑا۔ وہ محرم ۱۲۳۲ھ (مطابق اگست ۱۸۲۶ء) میں لکھنؤ پہنچے تھے اور یہاں سے ۲۶ ذی قعدہ سالِ مذکور کان پور کے لیے سوار ہوئے۔ بقول حالی:

جب مرزا نے دہلی سے کلکتے جانے کا ارادہ کیا تھا، اُس وقت راہ میں فیصلہ کرنے کا قصد نہ تھا، مگر چوں کہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ مرزا ایک بار لکھنؤ آئیں اس لیے کان پور پہنچ کر ان کو خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھتے چلیے۔ اس زمانے میں نصیر الدین حیدر فرماں روا اور روشن اللہ نائبِ استسما تھے۔ اہل لکھنؤ نے مرزا کی عمدہ طور پر ہدایات کی اور روشن اللہ کے ہاں بینواں شائستہ ان کی تعریف کی گئی۔

حالی کو یہاں تسلیج ہوا ہے۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں نصیر الدین حیدر کے والد بادشاہ نازی الدین حیدرؒ ۲۵۵ سر پر آراءے سلطنت تھے اور حکومت کے نظم و نسق کی ہانگ ڈور نواب آغا میرؒ ۲۵۶ کے ہاتھ میں تھی۔ مرزا نواب صاحب سے بہت ملتا جلتے تھے اور انہیں اس بات کا بھی یقین تھا کہ وہ بادشاہ سے ان کی مدد کروائیں۔ جب لٹے کی نوبت آئی تو مرزا نے جلدی میں ایک مدیر نثر معصوب قحطیل میں لکھ کر نواب آغا میر کی خدمت میں پیش کیا۔ مرزا اس بارے میں لکھتے ہیں:

میر ہانہاں گرد آمدند و بزرگان انجمن خندہ و رفتہ رفتہ و کبر خاکساری
ہاے مرا بہ بزم آغا میر نای از سادست علما آں دیار کہ دریاں
روز با بہ آہنگ معتدلفہ و گئی بلند آوازہ بود رو بہ ترخانہ فرمانراے
آں کشور و مدارالہامی آں سلطنت اشہار داشت رسانیدند تا
ازاں جانب ایما کششے رفت و ازین نو نیز آشوب ہوں گل
کرد۔ چوں ملازمت قرار یافت خواہم دست مایہ عقیدتے سر
الہام دادن و رہ آورد عالم مودیتے عرضہ داشتن، طبع از فکر قصیدہ
ٹھکی کرد و سینہ بریں آرد و گئی۔ بخون شوقم بہ پیدائے کنار
نابیدائے نثر انعامت و سواد مہارتے ہم در معصوب قحطیل روشن
ساخت۔ ۲۵۷

مرزا کی ہزار تمنائوں کے باوجود آغا میر سے کوئی ملاقات نہ ہو سکی۔ حالی ملاقات کی ناکامی کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مرزا نے:

»شرطیں ایسی پیش کیں جو منظور نہ ہوئیں۔ ایک یہ کہ نائب میری
تعظیم دیں، دوسرے، غدر سے مجھے معاف رکھا جائے۔ یہ شرطیں
منظور نہ ہوئیں اور مرزا ہادل ناخواستہ ٹکٹ روانہ ہو گئے۔ ۲۵۸

مرزا ملاقات نہ ہو سکے کی وجہ یہ لکھتے ہیں:

انچہ در باب ملازمت قرار یافت، خلاف انجمن خواہن داری و

تک شبیر، خاکساری بود۔ کھیلی ایں افعال و توفیق ایں ابہام جز
پہ تقریر ادا تھاں کرد۔ ۱۵۷

کچ تو یہ ہے کہ مرزا کو نواب آغا میر عرف معتقدہ دلہ سے بڑی امیدیں
دایت تھیں، جن پر پانی پھیر گیا۔ وہ نواب صاحب سے ہزار خواہشوں کے ساتھ ملتا
چاچے تھے، جیسا کہ ان اشعار سے مزخرف ہوتا ہے:

اے روتا ہے کہ بزم طرب آبادہ کرد
برق بستی ہے کہ فرست کوئی دم ہے ہم کو
طالع ربیع سڑی نہیں پاتے اتنی
بھر یاران وطن کا بھی الم ہے ہم کو
لائی ہے معتقدہ دلہ بہادر کی امید
جادو رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو ۱۵۸

ایک اور جگہ نواب آغا میر کی سردہری کا ذکر ان اشعار میں ملتا ہے:
لکھو آنے کا باعث نہیں کھتا یعنی
ہوں سیر و کاشا سو وہ کم ہے ہم کو
مطلع سلسلہ شوق نہیں ہے یہ شہر
حرم سحر نجف و طوف حرم ہے ہم کو
لے جاتی ہے کہیں ایک توفیق غالب
جادو رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو ۱۵۹

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اڈل اڈل مرزا کو نواب معتقدہ دلہ سے حوصلہ افزا
امیدیں تھیں۔ اسی برتے پر انھوں نے لکھو میں قیام کیا تھا۔ جب دیکھا کہ وہ سخت کیر
حاکم ہیں تو غالب کے دل میں تبدیلی آئی۔ اسے عجیب مل گیا کہ غلام میں ان کی سخت
گیری اور نا انصافیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

ہر چہ وہاں بلا از کرم خطائی و فیض رسائی ایں گدا طبع سلطان

صورت یعنی معتقد دل آقا میر شنیدہ می شد، بلکہ کہ حال برعکس
 است۔ در ابتدا سے دولت ہر کرا ایک حصول مدعا سے خود دیدہ بر
 دے چید۔ لاجرم یک دو کس بہ ہر رنگ متخلف کشیدہ و انکوں کہ از
 احتکام اساس دولت خود خاطرش متع است۔ در بد متع زر افتادہ
 است جملہ خانہانہاے قدیم از بیداد ایں بے رحم بہ سیلاب فنا
 رسیدہ و نازہ و درگان ایں دیار آوارہ جہات کتنی گردیدہ و او خود از
 تر دیتی و اسراف خود پیشیاں شدہ و از ایں شیعہ برکشت۔ بالکلہ بازار
 بیداد گرم است۔ مہاجتان و ساہوکاران و تاجران پشیاں پشیاں ز
 دودل خود بہ کان پارے رسانند و انکں غنیمت ہر کہ یوں گر بخت و
 ہر کہ بہت دیر گر بختن است۔ چوں حال ایں دیار بر ایں رنگ
 است آں خوشتر کہ سخن از خود نہ گویم۔ تاریخ بہت و عظیم ذی
 تعدہ روز بعد از آں ستم آباد برآمد و تاریخ بہت و نیم در
 دارالسرور کان پارہ رسیدم۔ ایں جا در سر مقام گزیدہ ماہگراے
 بادشاہی شوم۔ ۱۰۵۰

مرزا کی تقریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب آغا میر کی عدم توفیق کی وجہ سے
 انھیں بادشاہ غازی الدین حیدر کی حکومت سے کچھ نہیں ملا۔ ۱۰۵۰ اگر نواب کو مرزا سے
 دلچسپی ہوتی اور وہ انھیں بادشاہ سے ملائے تو مرزا خانی ہاتھ لکھو سے نہ نکلتے۔

غازی الدین حیدر کے انتقال کے بعد ان کے صاحب زادے نصیر الدین
 حیدر ۱۰۵۰ بادشاہ منتخب سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے۔ مرزا نے ان کے ساتھ رابطہ قائم
 کرنے کے لیے سلسلہ بیانی شروع کی۔ اور ۱۲۳۳ ہجری میں ان کی شادی کی تقریب
 پر ایک قطعہ تہنیت ”در تاریخ طوے کھدائی پادشاہ اور“ کے عنوان سے ۲۵ شعر میں
 لکھا۔ ”آؤ تاریخ“ ”نیم عشرت پود“ ہے جس سے ۱۲۳۳ ہجری کے احوال نکلتے ہیں۔

قلم کے چند شعر یہ ہیں:

روحِ فلّٰہ ز جوشِ گل کہ وہ
 مرضِ گنجینہٗ سبا و شہل
 دہر گوئی شدتِ سر تا سر
 بزمِ طوے ہم ستورہٗ نصال
 شاہِ عالم نصیرِ دیں کہ بود
 دلکشِ امین از گزیرِ زوال
 یہ طرازِ رقمِ سلیمان چاہ
 یہ نظامِ اثرِ ہمایوں قال
 باد اے ابوب سپہرِ شکوہ
 یہ صلاے کرمِ سحابِ لوال
 اسدِ فلّٰہِ خاں کہ خواندش
 درِ سخنِ پادشہٗ لیلیٰ شال
 یہ آوازِ گزارشِ تاریخ
 ریخت بر گوشےٗ بساطِ لال
 بحرِ ترجمہٗ ایں ہمایوں جشن
 کہ یہ خسروِ مجتہدِ بادِ ہلال
 زو رقم "بزمِ عشرتِ پدید"
 دیکھ کلفتم بود ز زوےٗ نصال
 در تو خواہی کہ آفتابِ سود
 حقِ اندازِ مسکینِ سال
 شاہِ عجبِ پادشاہِ لولیس
 دیکھش بر فراہ جشنِ کمال

مرزا نے ایک قصیدہ لکھا بادشاہ نصیر الدین حیدر کی مدح میں ۱۰۳ شعرا دہلی سے مفتی محمد حسن کے ذریعے بادشاہ موصوف کی خدمت میں لکھوا بیجا۔ غالب مرزا نے یہ قصیدہ قیامِ کلکتہ میں کہا تھا۔ اس وقت نواب روشن الدولہ نائب تھے۔ چند شعر یہ ہیں:

مگر یہ سنیل کدۂ روضۂ روضاں رقم
 ہو یا زلیخا ترا سلسلہ بختیاں رقم
 ذوقِ غم حوصلہ لذتِ آزادوں داد
 پائے کوہاں بسرِ خارِ سفلیاں رقم
 لکھو دامِ نکلاٹے سرِ راہم مسترد
 بے خود از دولتِ شوق پر افشاں رقم
 از بجائے ظلم آہنگِ نظمِ کرم
 بدو پارِ کبر خسرو گیہاں رقم
 شاہِ بختیاء کہ دولتِ بدشِ ناصیہ ساست
 ہم چہ دولتِ بدشِ ناصیہ سایاں رقم
 آں فریادوں فرہِ جہشید مہابت کہ بہ فر
 ز آستانش بسرِ مسوِ خاکاں رقم
 حذا رحمتِ عالی کہ ز فیضِ کرمش
 ہمہ دردِ آہدہ بودم۔ ہمہ دہماں رقم
 چوں شنیدم کہ ترا نائبِ مہدیؑ کوچد
 بحرِ تسکین بہ طلبِ کاری برہاں رقم
 ہم ز است کہ دہ نصرتِ دینِ حیدر
 صفتِ ذاتِ تو دایم و نازاں رقم
 روشن الدولہؑ بھار کہ بانہار و عطا
 حاشش گفتیم و شرمندۂ نقصاں رقم
 تو سلیمانی و لو آصف و من مورِ ضعیف

راو نسبت مللی ہیں کہ چہ شایاں رستم
 صلہ یو میستم و شعر فردی نہ کنم
 راو مدح تو بسرگری ایماں رستم
 آدم بر در سنجو علی مدح سراے
 نہ بد کوئی گنجینہ خاقاں رستم
 مدح چاپ مہدی ز محبت باشد
 شادمانم کہ چہ نہار بجاں رستم
 از ظلمات علی ساخت دلاے تو مرا
 تہلیت خواہ بر بخور و سلاں رستم
 شایگان گشت قولی ہم در نامہ شوق
 بکہ بے خویش پہ آراہی عنوان رستم
 آب و رنگ ختم نگر و مفردم دار
 مگر چو عرفی رو خریہ پہ ہدیاں رستم
 شرف ذات من امی بکہ شاخوانی تو ام
 عزت و فخر نسب ما نہ شاخوان رستم
 غالب از راو اب لب بدعا باز کشا
 تا نہ دامن کہ رو فکر پریشاں رستم

مرزا اس قصیدے کے بارے میں سبحان اللہ خان کنبدہ ۱۲۸۵ کو، جو اس زمانے میں لکھنؤ کے نہایت ہی ذی حشم روسا میں تھے، ایک خط میں لکھتے ہیں:

امی عرضداشت پہ فردغ نگاہ قبول آسج جانی (روشن القدل)
 شرقیان گردد د امی قصیدہ پہ بزم مینو مثال سلیمانی (ضمیر الدین)
 حیدر بادشاہ) خواندہ شود تا مرا کہ سخن بچو ستائش نگارم پہ جائزہ
 ضروری زبغ امتیاز المرودش پذیرد۔ واللہ صلہ ہماں گرامانگی کہ

ہم بہ دہرم بلکہ نامی دہم در نظر خویش گرامی کند۔

مرزا ایک اور خط میں سبحان اللہ خان کو لکھتے ہیں کہ معلوم ہوا ہے کہ یہ قصیدہ نواب روشن اللہ کو بے حد پسند آگیا، لیکن معلوم نہیں کہ بادشاہ کی خدمت میں پیش ہوا کہ نہیں۔ ۱۸۳۸ء ایک اور خط میں مفتی محمد حسن کو لکھتے ہیں کہ قصیدے کا سطرل جائے تو میں دو ہزار پانچ سو کے مقدّمے کے سطرلے میں کلکتے جانے کا بندوبست کروں۔ ۱۸۳۸ء

بادشاہ نصیر الدین حیدر نے اس قصیدے کے سطرلے میں مرزا کو پانچ ہزار روپے معائنات کیے جو بیچ میں اڑا لیے گئے تھے، یعنی نواب روشن اللہ نے تین ہزار اور مفتی محمد حسن نے دو ہزار ہڑپ کر لیے۔ غلط زدہ غالب کے نصیب میں ایک کوڑی بھی نہیں تھی۔ اس بات کا انکشاف شیخ تاریخ (موتی: ۱۸۳۸ء) نے مرزا کے نام ایک خط میں کیا تھا۔ انھوں نے اس واقعے کی زوہاد و شہبہ ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء کو مرزا تقی محمد ۱۳۵۲ کے نام ایک خط میں یوں کیا تھا:

بڑا پرانا قصہ تم نے یاد دلایا۔ دارغ کہہ حضرت کو چکایا۔ یہ قصیدہ مفتی محمد حسن کی معرفت روشن اللہ کے پاس اور روشن اللہ کے قوتل سے نصیر الدین حیدر کے پاس گزرا۔ اور جس دن گزرا، اسی دن پانچ ہزار روپے بیچنے کا حکم ہوا۔ حوتل، یعنی مفتی محمد حسن نے مجھ کو حکام نہ دی۔ مظفر اللہ مرحوم ۱۳۵۲ لکھنؤ سے آئے۔ انھوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا اور کہا، خدا کے واسطے میرا نام مفتی محمد حسن کو نہ لکھا۔ ناچار میں نے شیخ امام بخش تاریخ کو لکھا کہ تم دریافت کر کے لکھو کہ میرے قصیدے پر کیا گزری۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ پانچ ہزار سطرلے، تین ہزار روشن اللہ نے کھائے، دو ہزار مفتی محمد حسن کو دیے اور فرمایا کہ اس میں سے جو مناسب جانو، غالب کو بھیج دو۔ کیا اس نے جنوز کچھ نہ بھیجا۔ اگر

نہ بھیجا ہو تو مجھ کو نکلو۔ میں نے لکھ بھیجا کہ مجھے پانچ روپے بھی نہیں پہنچے۔ اس کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ اب تم مجھے خط نکلو۔ اس کا مضمون یہ ہو کہ میں نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھیجا ہے اور یہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ وہ قصیدہ حضور میں گزرا، مگر یہ میں نے نہیں جانا کہ اس کا صلہ کیا مرحمت ہوا۔ میں، کہ تاج شاہ ہوں، اپنے نام کا خط بادشاہ کو پڑھوا کر اُن کا کھایا ہوا روپیہ اُن کے حلق سے نکال کر تم کو بھیج دوں گا۔ بھائی، یہ خط میں نے ڈاک میں روانہ کیا۔ آج خط روانہ ہوا۔ تیسرے دن شہر میں خبر اڑی کہ نصیر الدین حیدر مر گیا۔ اب کہو، میں کیا کروں اور تاج شاہ کیا کرے۔ ۱۸۳۲ء

نصیر الدین حیدر کے انتقال کے بعد ان کے چچا محمد علی شاہ (متوفی: ۱۸۳۲ء) اودھ کے تخت سلطنت پر رونق افروز ہوئے۔ مرزا کی کسی تحریک سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آیا انھوں نے بادشاہ کے ساتھ کوئی رابطہ کیا تھا یا ان کی تعریف میں کوئی قصیدہ کہا تھا؛ البتہ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحب زادے امجد علی شاہ ۱۸۳۲ء کی مدح میں انھوں نے ۶۵ شعر کا ایک قصیدہ کہا۔ چند شعر درج کیے جاتے ہیں:

شادم کہ گردشے بہ سزا کرد روزگار
بے باورہ کام بیش روا کرد روزگار
تار بہاٹ انجمنی انجساٹ را
چوں تار ساز فقر سرا کرد روزگار
در مدح شاہ غالب رنگیں ترانہ را
چوں بلبلان ترانہ سرا کرد روزگار
تازم نظام نامی سلطان کہ از شرف
ترکیب آں ز مجد و علا کرد روزگار

امجد علی شاہ آں کہ بذوق دعاے او
 صدرہ لہاز صبح قضا کرد روزگار
 اے آنکہ روزنامہ حکم ترا بہ دہر
 فہرست کار ہاے قضا کرد روزگار
 از شکلی ماہ نو پہ گمانم کہ ماہ ما
 بر در کہ تو تاصیر سا کرد روزگار
 دانی کہ درخشن پہ کہ نامن زمین میرس
 ایں دھوی محال کیا کرد روزگار
 ہم پایہ تو عالی و ہم دستگار نظم
 ہر صبح ما دو بار ثنا کرد روزگار
 تا بست عہد ہستی خود با بقاے شاہ
 پیدا طریق شرط و جزا کرد روزگار

اس قصیدے کا صلہ بھی مرزا کو کچھ نہیں ملا۔ اس کے بارے میں وہ نواب
 انوار اللہ ولد شفیق ^{۱۳۳۵} کو لکھتے ہیں کہ:

ایک حکایت سنو۔ امجد علی شاہ کی سلطنت کے آغاز میں ایک
 صاحب میرے نیم آستانہ یعنی خدا جانے کہاں کے رہنے والے کسی
 زمانے میں دار و اکبر آباد ہوئے تھے۔ کبھی کہیں کے تحصیل دار بھی
 ہو گئے تھے، زبان آدھ اور چالاک۔ اکبر آباد میں نوکری کی جستجو کی،
 کہیں کچھ نہ ہوا۔ میرے پاس دو ایک بار آئے تھے۔ پھر وہ
 خدا جانے کہاں گئے۔ میں دلی آ رہا۔ کم و بیش میں برس ہوئے
 ہوں گے۔ امجد علی شاہ کے عہد میں ان کا خط تاجپاہ مجھ کو بمبئی
 ڈاک آیا۔ چوں کہ ان دنوں میں دماغ درست اور حافظہ برقرار
 تھا، میں نے جانا کہ یہ وہی بزرگ ہیں۔ خط میں مجھ کو پہلے یہ

مصرع لکھا:

از بخت شکر دارم و از روزگار ہم
آپ سے جدا ہو کر میں برسِ آوارہ پھر۔ جے پھر میں تو کر ہو گیا۔
وہاں سے دو برس کے بعد کہاں گیا اور کیا کیا۔ اب لکھو آیا
ہوں، وزیر سے ملا ہوں۔ بہت عنایت کرتے ہیں۔ بادشاہ کی
ملازمت انھیں کے ذریعے سے حاصل ہوئی ہے۔ بادشاہ نے
'حانی' اور 'مہاروی' کا خطاب دیا۔ مصاحبوں میں نام لکھا ہے۔
مشاہرہ ابھی قرار نہیں پایا۔ وزیر کو میں نے آپ کا بہت رشتہ کیا
ہے۔ اگر آپ کوئی قصیدہ حضور کی مدح میں اور عرضی یا خط، جو
مناسب چلیے، وزیر کے نام لکھ کر میرے پاس بھیج دیجیے گا تو
بے شک بادشاہ آپ کو بلائیں گے اور وزیر کا خط مشعر فرماں طلب
آپ کو پہنچے گا۔ میں نے اسی عرصے میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس
کی وجہ اسم یہ ہے:

احمد علی شاہ آنکھ پہ ذوقِ دعا سے او

صدرہ نماز صبح قضا کرد روزگار (ارج)

مترود تھا کہ کس کی معرفت بھیجوں۔ تو کلفت علی اللہ بھیج دیا، رسید
آگئی صرف، پھر دو ہفتے کے بعد ایک خط آیا کہ قصیدہ وزیر تک
پہنچا۔ وزیر پڑھ کر بہت خوش ہوا۔ بائین شائستہ پیش کرنے کا
وعدہ کیا۔ میں متوقع ہوں کہ میاں بدرالدین شکر کن سے میری
سب خطابی کھدا کر بھیج دیجیے، چاندی کا گینہ، مرغ اور قلم جلی، فقیر
نے سرانجام کر کے بھیج دیا۔ رسید آئی اور قصیدہ کی بادشاہ تک
گزرنے کی نوید، بس ۱ پھر دو مہینے تک ادھر سے کوئی خط نہ آیا۔
میں نے جو خط بھیجا، الٹا پھر آیا۔ ڈاک کا یہ توقع کہ کھوب الیہ

یہاں نہیں۔ ایک مدت کے بعد حال معلوم ہوا کہ اُس بزرگ کا وزیر تک پہنچا اور حاضر رہنا بچ۔ بادشاہ کی ملازمت اور خطاب کا ملنا غلط۔ بہادری کی سہرا تم سے بفریب حاصل کر کے مرشدآباد کو چلا گیا۔ پچھلے وقت وزیر نے دو سو روپے دیئے تھے۔ ۲۲۵۰
غالب ایک اور خط ۵ دھند ۵ جولائی ۱۸۳۹ء میں میر احمد حسین میکیش ۲۵۰۰ کو، جو کچھ سرے کے لیے لکھو گئے تھے، لکھتے ہیں کہ:

امجد علی شاہ مرا بہ ندی پذیرفت و فرمان داد کہ پنج ہزار بہ طریق زار راہ، ہنگی وہ ہزار روپے فرستادہ شود و قلائے دریں چا طلبد و شود۔ بنور ایں حکم امضا نہ پذیرفت بود کہ سرطان برآورد و دو ہفتہ صاحب فراش ماند و مرد۔ ۲۹۵۰

[اورد ترجمہ از وزیر اکمن عابدی]

امجد علی شاہ نے مجھے مدیم بنایا اور فرمان صادر کیا کہ پانچ ہزار روپے صلے کے طور پر اور پانچ ہزار بطور زار راہ، کل دس ہزار روپے بھیجا جائے اور قلاں شخص کو یہاں طلب کیا جائے۔ ابھی دست خط نہ ہونے پائے تھے اور یہ حکم جاری نہ ہوا تھا کہ سرطان نکل آیا اور دو ہفتے صاحب فراش رہ کر مر گیا۔ ۲۹۵۰

امجد علی شاہ کے انتقال (۱۳ فروردی ۱۸۴۷ء) کے بعد میکیش نے غالب کو مشورہ دیا تھا کہ جو قصیدہ انھوں نے امجد علی شاہ کی مدح میں لکھا تھا وہ واجد علی شاہ کے نام منسوب کیا جائے۔ غالب کو یہ مشورہ پسند نہیں آیا۔ انھوں نے اس کے جواب میں میکیش کو جو خط نومبر ۱۸۴۸ء (۱۲۶۵ ہجری) میں لکھا تھا، وہ یہ ہے:

[اورد ترجمہ از وزیر اکمن عابدی]

تم نے جو کچھ بطور اطلاع لکھا تھا وہ دل غم زدہ کے لیے ہامی شادمانی ہوا لیکن جو کچھ میرے لیے بطریق حکم مرقوم تھا وہ میری

مجھ میں نہیں آیا اور اس سے میرے سوداگی دل کو کسی قدر پریشانی ہوئی۔ میرا دوپائی فاری [مطبوعہ ۱۸۳۵ء] دہلی سے مدراس اور حیدرآباد تک اور لاہور سے ہرات و شیراز تک پہنچ چکا ہے۔ شاہِ جنت آرام گاہ [امجد علی شاہ] کی مدح کا قصیدہ [شادم کہ گردشی ہوا کرد روزگار] اس میں درج ہے اور ایک دنیا اس کو دیکھ چکی ہے۔ یہ تک اپنے اوپر کیسے روا رکھوں کہ اسے کسی دوسرے کے نام کر دوں۔ سیم و زر و لعل و گہر نہیں کہ میری دست رس سے باہر ہو۔ کلام ہے جو مبدعِ فیاض سے [مجھے] تنج و در تنج عطا ہوا ہے اطمینان رکھیں، جیسے ہی شاہ صاحب [قلب شاہ] کی طرف سے خط کا جواب ملے گا، نیا قصیدہ اور نیا قطعہ آپ کے پاس پہنچ چکا ہوگا لیکن شرط یہ ہے کہ خلافِ واقعہ بات مجھے نہ لکھیں اور جیسا میں کہوں ویسا ہی کریں۔ فی الحال کام یہ ہے کہ شاہ صاحب کے نام کی مرضی شاہ صاحب کو پہنچا کر اس کی سبیل نکالیں کہ شاہ صاحب یہ مرضی نواب صاحب [قلب اللہ قلب علی خان] سے کو دکھا کر اور اس کی عہادت کا دغا انھیں تاکر قصیدہ بیچنے کی اجازت لے لیں تاکہ یہ قصیدہ [غن ز روضہ رضوان بکوعے یار کھد] حسیں بھیج دوں۔ اس کا اطمینان رکھیں کہ نواب [قلب اللہ] کی مدح کا قطعہ بھی اس کے ساتھ ہوگا۔

یہ کوشش نہیں کرنی ہے کہ شاہ [اودھ] مجھے اپنے ہاں بلائے۔ پوری کوشش اس بات کی کرنی ہے کہ صلہ مل جائے۔ اس کے بعد اگر شاہ [اودھ] میرے طالب ہوں گے تو زاہد راہ کے لیے کچھ اور رقم بھیجیں گے ورنہ میں اس صورت میں، کہ قرض کا بھاری بوجھ مجھ پر نہ رہے، اس کوشہ و خوشے پر قناعت کروں گا جو مجھے حاصل

ہے۔ ایسے موقع پر میری مختصر تحریر کو بہت سمجھیں۔ ان شاء اللہ میرا خدا سے عہد ہے کہ ہمیشہ راست گفتاری سے کام لوں گا۔ حقیقت یہی ہے جو میں نے لکھی۔ منصب و اقتدار نام و نمود اور خود آرائی مجھے مطلوب نہیں۔ ایک راحت و فراغت چاہتا ہوں اور بس! اور اس راحت و فراغت کا حصول اس بات میں ہے کہ قرض ادا ہو جائے اور قرض کا ادا ہونا اتنی رقم سے ممکن ہے جتنی کا میں شاہ اودھ سے بطور صلہ متوقع ہوں۔ اللہ! بس۔ ماسوا ہوں! ۱۹۵۵

انہی دنوں واجد علی شاہ سخت بیمار ہو گئے تھے اور ان پر جنوبی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ قرض داروں نے بھی پریشان کیا تھا۔ جون ۱۸۴۸ء میں واجد علی شاہ اپنے بیٹے شہزادہ مرزا محمد جاوید علی بہادر کی خبر سن کر انتہائی غم زدہ ہو گئے اور بادشاہ کی طرف سے ایسے حالات میں امداد ملنے کی امیدیں دم توڑ گئی تھیں۔ چنانچہ میکس کو لکھتے ہیں:

[[أردو ترجمہ از وزیراعظم حایدی]]

قصیدہ [خن ز روضہ رضواں بکوعے یاد کشد] دہانے کے سامنے کون لے جائے، اور اسے کیا بتائے کہ یہ کیا ہے۔ قرض کیا کہ یہ بھی ہوا اور قصیدہ ملاحظے میں بھی لایا گیا اور پڑھ کر سنانا شروع کیا لیکن دہانے نے ہنسا اور سر ہلانا شروع کیا اور پڑھنے والے کے ہاتھ سے کاغذ لے کر دانتوں میں چبا کر زمین پر پھینک دیا، یا سنا اور کسی دوسرے معاملے کی طرف متوجہ ہو گیا اور سانک کے مقصود کے بارے میں کوئی بھی بات نہ کی [تر کیا نتیجہ ہوا]۔ بالفرض ماہ تسلیم قصیدہ سننے کے بعد بعد ازاں اللہ بون خوں خلعت بھیجے یا ہزار اشرفیاں بخشے کا حکم بھی دیا تو اس کے حکم کی تعمیل کون کرے۔ خلعت کون بھیجے اور خزانے سے رقم کون دے۔ سلطنت

کے کارپرداز دیوانے کے حکم دینے پر رقم کیوں دیں اور خلعت کیوں بھیجیں۔ اگر بادشاہ مجتوں ہے تو وزیر امدادِ ولہ منظم الملک علی نقی خان بہادر سہراب جنگ کاغلب بہ حضور عالم بہادر تو دیوانہ نہیں۔ غرض یہ سب باتیں میری فکر میں ہیں اور تیرے فکر پر حیرت زدہ ہوں۔ ہر چند تم اس خیال سے کہ میں شکستہ دل اور غم کیس نہ ہوں، امید دلاتے ہو اور امر واقع کو مجھ سے چھپاتے ہو، لیکن ایسے بڑے راز کب چھپتے ہیں۔ یہ بات عالم آشکارا ہے کہ شاہ اودھ بالکل دیوانہ ہے۔ وزیر کیج داور و مرید سے کام لیتا ہے۔ اس تحریر سے مدعا یہ ہے کہ اس تعقلِ خاطر سے میں قلعہ فکر کر چکا ہوں اور کسی طرح کی توفیق کا شائبہ بھی باقی نہیں۔ تمہاری طرف سے کرمند ہوں اور قلبِ لذتہ کے بارے میں بھی (جو زبیر خطاب ہے) مجھے غم ہے۔ ۲۰۵

ادھر بادشاہ کی بیماری دفع ہونے لگی اور جشنِ شملِ صحت کا اہتمام کیا جانے لگا۔ ادھر غالب کی جان میں جان آگئی۔ بادشاہ کے عطیات و انعامات کی امیدیں پھر سے کروٹ لینے لگیں۔ قرض داروں کی ادائیگی کے بعد کچھ رقم بچ جاتی تو فریضہ رجب اور زیاراتِ قہاتِ عالیات سے بھی فیضِ یاب ہو جاتے۔ ۲۳ دسمبر ۱۸۴۸ء کے طویل خط میں سیکش کو لکھتے ہیں:

[اردو ترجمہ از وزیرِ افسن عابدی]

میری جان! قصیدہ پہنچتا ہے۔ خود پڑھیں اور نواب صاحب اقلبِ لذتہ! تک پہنچائیں اور اس کی کوشش کریں کہ بادشاہ [اداج علی شاہ] کی نظر سے گزرے اور صلہ ملے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے حسنِ سلوک اور نواب صاحب کی عنایت سے ضرور بادشاہ تک پہنچے گا۔ پھر کیا ہوگا؟ لوگ کہتے ہیں کہ لامحالہ صلہ

دینے کا حکم صادر ہوگا تو وزیر (امینِ اذ دلہ) اس کے نام صادر ہوگا اور وزیر کے (توسط) کے بغیر کام نہ ہو سکے گا۔ ایسی صورت میں مجھے اندیشہ ہے کہ کام بگڑ جائے گا۔ چارہ کار یہی ہو سکتا ہے کہ اس بابے میں نواب صاحب پر یہ اندیشہ ظاہر کر دیا جائے اور میری طرف سے کہا جائے کہ غالب کہتا ہے کہ میں گدائے یک در ہوں اور (نواب) قطبِ اذ دلہ کے سوا دوسرے کو نہیں جانتا، اس لیے قطبِ اذ دلہ کو چاہیے کہ مجھے دوسرے کا محتاج نہ کریں اور قصیدہ خود پیش کریں اور صلہ حاصل کریں اور خود مجھ تک پہنچائیں۔ جب یہ کام بن جائے، وزیر بیچ میں نہ آئے اور جیسا کہ میں نے کہا کہ نواب قطبِ اذ دلہ ہی کی مہربانی سے مقصود صل (کنڈر حاصل) ہو جائے تو چوں کہ یہ مقصود رقم ہے اس لیے خود سوچیں کہ رقم لکھو سے مجھ کو کیسے سمجھیں گے۔ ظاہر ہے، ہندوی سے سمجھیں گے۔ شہر (لکھنؤ) بیکانہ، شہر کے لوگ عیار پیشہ اور تم کو شہر کے ساہوکاروں سے کوئی واقفیت نہیں۔ ایسا نہ ہو، کوئی قہاحت پیدا ہو۔ اس کا مداوا یہ ہے کہ جب کوئی رقم عطا ہونے کا حکم مل جائے تو نواب صاحب کی خدمت میں عرض کریں کہ میں مسافر ہوں، ہندوی حاصل کرنے کا طریقہ نہیں جانتا، حضور کسی کامل احمد اور اپنے محنتل ساہوکار کو بلا کر رقم اس کو دے دیں اور ہندوی اس سے لکھوا کر اپنے خط کے ساتھ ملخوف کر کے مجھے عطا فرما دیں تاکہ میں وہ خط اسد اللہ خاں کو بھیج دوں؛ لیکن یہاں ایک بات کہنی باقی ہے، یعنی میں نے جو رقم تم کو دینے کی ہے، وہ کس طرح تم کو دوں، یہ بات تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پانچ ہزار روپے میں سے

پانچ سو روپے تم کو دوں۔ تم چاہو تو یہ رقم دہیں لے لو، اور اگر تم یہ چاہو کہ قلعہ الذولہ پر یہ بات ظاہر نہ ہو تو نکسو تاکہ ہٹھوی کی پوری رقم بچنے کے بعد میں پانچ سو روپے تم کو بھیج دوں۔

یکملی صورت میں ایک الگ سرشدہ خط حصیں بھیج دوں اور تم اپنے نام کا وہ خط نواب صاحب کے ملاخطے میں لا کر پانچ سو روپے اپنے پاس رکھ لو اور چار ہزار پانچ سو روپے کی ہٹھوی، جیسا کہ میں نے لکھا ہے، نواب صاحب سے لے کر مجھے روانہ کر دو۔

میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر تمہاری صلاح یہ ہوگی تو میں تمہارے خط میں یہ نہیں لکھوں گا کہ پانچ سو روپیہ میں نے تم کو دیا بلکہ پانچ سو روپے کی فلاں فلاں اجناس خرید کر تم بھیجوں گے۔ میرے اس سوال کا جواب جلد لکھ بھیجو؛ لیکن دوسرا اندیشہ سب سے زیادہ روح فرسا ہے، یعنی میں شہرِ ادلیٰ میں قرض دار ہوں اور [کئی] ڈگری دار ہیں۔ اگر انہیں پتا چل گیا تو اپنی ڈگری بخش کر کے قانوناً رقم مجھ سے لے جائیں گے اور میری اور تمہاری کوشش مانچاں جائے گی۔ اس زخم کو دو مراہوں کی احتیاج ہے۔ ایک یہ کہ ہٹھوی میرے نام کی نہ ہو۔ ”صرف شاہِ جوگ“ ہو [جو کوئی شخص بھی لے سکتا ہے]۔ دوسرے یہ کہ جس طرح پہلے قلعہ الذولہ کے [میرے نام] خط بھیجنے کی اطلاع اپنے دوستوں کو لکھ بھیجی تھی۔ [اس مرتبہ] یہ خبر کسی کو نہ لکھیں اور ایسا کریں کہ میرے اور تمہارے سوا کسی دوسرے کو پتا نہ چلے کہ کیا ہوا اور یہ معاملہ کہاں تک پہنچا۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ۔

جہاں بے مراد گیتی دشمن و دلدار مستغنی
مرا بر آرزو ہائے شاکلی شہدای آید

خط طم ہوا، لیکن طم دل اسی طرح جوش زن ہے اس لیے کلمے کو
مکڑ لکھتا ہوں۔ میرے یہ تمام ٹکڑات صحیح ہیں۔ ان میں سے
ایک بھی بے بنیاد نہیں۔ بارے قصیدہ | سخن ز روضہ رضواں بکوسے
یار کھد | پہنچنے کے بعد مناسب فکر کرنا اور معاملے کے تمام
پہلوؤں اور گرد و پیش کو دیکھ کر اندازہ لگانا کہ کیا کرنا چاہیے۔ جو
مضمون مطلوب ہو، لکھتا تاکہ اس مضمون کا خط تمہارے نام، یا
اگر ضرورت ہو تو قطبِ قذالہ کے نام لکھ کر تمہیں بھیج دوں اور
قصیدہ پہنچنے کے بعد کے حالات بھی مجھ کو لکھتا کہ جب نواب
صاحب نے قصیدہ دیکھا تو کیا کہا، اور جب بادشاہ کے سامنے
پیش کیا تو بادشاہ نے کیا کہا۔ فرض یہ تمام باتیں لکھتا اور یہ
چیزیں لکھنے کے بعد صلے کے بارے میں تمہاری رائے میں جو
بات ضروری ہو، تحریر کرنا تاکہ اس مضمون کا خط تمہارے نام یا
نواب صاحب کے نام لکھ کر بھیجوں۔ اس بات کا بھی خیال رکھنا
کہ دہلی میں کسی شخص پر یہ امر ظاہر نہ ہونے پائے بلکہ بھتر یہ
ہے کہ قصیدہ پہنچنے ہی اس کے پہنچنے کے بارے میں فوراً مجھے خط
لکھتا، تاکہ میرے دل کو اطمینان ہو اور اس کے بعد قصیدے کا
بادشاہ کے حضور میں پیش ہونا اور بادشاہ کے حکم کا صادر ہونا، یہ
سب ٹھیک ٹھیک لکھتا اور بتانا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور یہ کہ
تمہارے نام خط لکھتا چاہیے کہ نواب صاحب کے نام | اور ان
کے نام | کس مضمون کا خط لکھا جائے۔ یہ سب لکھ کر بھیجنا اور ہر
بات پر، جو میں نے کہی ہے، خوب توجہ کر کے اور پوری دقتِ فکر
سے کام لے کر ایسا جواب مجھے لکھتا جو سراسر صلاح ہو عین
صواب ہو۔ کام کا آغاز بڑی خوبی اور خوش اسلوبی سے ہوا

ہے اور فی الحقیقت تم نے ایک بڑا کام کیا ہے۔ اگر تمہارے بچے مثلاً روح الامیں کو بھی یہ کام سپرد کرتا تو اس سے بہتر طور پر انجام نہ پاسکتا، لیکن ہوشیار اور خبردار رہیں کہ انجام بھی اس کام کا ایسا ہی ہو جیسا آغاز اچھا رہا ہے۔ ایسا نہ ہو، آخر میں کوئی نفرت ہو جائے یا غفلت واقع ہو اور بنا ہتایا کام بگڑ جائے۔ خدا عظیم ہے کہ یہ میری آخری عمر ہے اور میں سخت عاجز اور حیران و پریشان ہوں۔ اس معاملے میں کچھ امید بندھی ہے اور تمہاری توقع پر ہی رہا ہوں۔ اولاد نے بوڑھے باپ کی بڑی خدمت کی ہے۔ اگر تمہاری سعی و کوشش اور حسن تدبیر سے یہ کام سرانجام پا جائے گا اور باوٹا و اودھ کی طرف سے صلہ اس طرح کہ میرے اور تمہارے سوا کوئی نہ جانے، مجھ کو مل جائے گا تو گویا اس کے بعد میری جو زندگی باقی ہے وہ تمہارے احسان کے زیر سایہ خوشی سے گزرے گی۔ اس وقت اس قرض سے، جس کا ہمارے لیے دوڑی فرسا ہے، میں سخت عاجز آ گیا ہوں۔ جب یہ ہماری بوجھ میرے شانوں پر سے اٹھ جائے گا تو پھر آئندہ میں اس تحفہ پر قناعت کروں گا جو سرکارِ انگریزی سے مجھے ملتی ہے اور خشک روٹی پر قناعت کر کے زندگی مستعار کے ہاتی مجھے گزاروں گا اور آئندہ بھی قرض نہ لوں گا، بلکہ اگر توفیق الہی شامل حال رہے گی اور دلاور ماہ باقی بچے گا تو کعبہ و مدینہ و نجف کا عزم کر کے گھر سے لکھوں گا۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ غالب کو اپنی ضروریات زندگی کی عدم دستیابی کی وجہ سے معمولی لوگوں کی طرف جھکتا پڑ رہا تھا۔ انھیں یقین تھا کہ سلطانِ عالم و اجدادِ علی شاہ کے دربار میں رسائی حاصل کر کے انھیں خاطر خواہ امداد ملے گی۔ انھوں نے

قلبِ اذ دل کو یہ ترغیب بھی دی تھی کہ اگر بادشاہِ اٹن پر مہربان ہوگا تو وہ زیادہ تر بلاے معنی کے لیے عراق جائیں گے۔ چنانچہ قلبِ اذ دل کے خط میں ۱۸ ذی قعدہ ۱۲۶۵ ہجری (۱۸۴۸ء) کو لکھتے ہیں:

[اُردو ترجمہ از وزیرِ اعلیٰ عابدی]

جنابِ نواب صاحبِ جمیل المناقب، مہمِ الاحسان، امیدگارِ مخلصان
دامِ بقاؤ و زوالِ خلافت کی خدمتِ مبارک میں ہدیہٴ سلامِ مستنون کی
پیش کش اور حمائے ملاقات و افراسخت کے اظہار کے بعد
گزارشِ مذکورہ یہ ہے کہ ایک طویل مدت گزری، اداہد علی شاہ
بادشاہِ اودھ کی مدح میں قصیدہ [خن ز روضہٴ رضواں بکوسے
یار کشد] اور ایک عرض داشت [بکھور شاہ] آپ کی خدمت
میں پہنچ کر بہ ہزار آرزو و درخواست کی تھی کہ یہ نظم اور نثر حضرت
قدو قدرت، ظلِ الٰہی، علو اللہ ملکہ و سلطانہ کی نظرِ ربوبیت اثر
کے سامنے پیش کر دیں۔ حقیقت (یہ) ہے کہ قصد یہ تھا کہ حلیہٴ
شاعی حاصل کر کے قہاتِ عالیات کا رخ کروں۔ راقم کی
ناسازی طالع پر وائے ہو کہ ابھی تک [تصور کی] اس بہار کی
جھلک نظر نہیں آ سکی ہے۔ شاہنشاہ کا دستِ کرم جو رحمت ہے جو
خار و گل پر یکساں برستا ہے۔ جہاں بے مانگے نعل و گہر کی کانیں
بچھتے ہوں۔ سوال کے بعد سائل کی محرومی کیسے ممکن ہے؟

بات یہ ہے کہ آں جناب نے اس درویشِ دل ریش کی طرف
توجہ نہیں فرمائی اور قصیدے اور عرض داشت کو حضرت خدیجِ آفاق
کی نگاہِ التفات کے لیے پیش نہیں کیا۔ وقت گزر رہا ہے، قافلہٴ
ردائے ہو رہا ہے۔ میرے ہم راہی آمادۂ سفر ہیں اور جلد روانہ ہونا
چاہتے ہیں، لیکن میں بھی ذوق و بے نوائی کے باعث اسی طرح

پا بہ نگل ہوں۔ خدا را اس کوششیں امداد کیس پر تم فرمائیں اور قصیدہ اور عرض داشت بادشاہ کے حضور پیش کر دیں اور جس صلیے کا حکم ہو، اس طرح کہ تاخیر نہ ہو، اس گداے امیدوار کو ارسال فرمائیں۔ اس سے زیادہ، دعاے دوام دولت حضرت ظفر سبحانی کے سوا، جو ہر دم دردِ نہاں ہے، کیا عرض کروں۔ نامہ نگار ہوا خواہ اسد اللہ، لکھنؤ روزِ شنبہ ۱۸ ذی قعدہ ۱۲۶۵ھ۔

مرزا غالب بسیار آرزو مند تھے کہ کہیں واجد علی شاہ سے صلیے کا فرمان صادر ہو جائے کہ وہ لکھنؤ کا رخ کریں۔ اس دوران انھوں نے نواب مظفر اللہ ولی نواب حسین مرزا ناظمیؒ، اختصار اللہ نوروز علی خانؒ اور قطب اللہ وغیرہ کو خطوط لکھے، لیکن کہیں سے کوئی امید افزا جواب نہیں ملا۔ چنانچہ مئی ۱۸۵۰ء والے خط میں شکایت کر لکھتے ہیں:

با آنکہ بچ مطلب ممکن روا نہ شد

دل خوش نمی کنیم مگر از محال ہا

جس دن سے تم لکھنؤ میں جا کر رہے ہو اور خود تمھاری تحریروں سے ظاہر ہوتا رہا ہے کہ حسین قطب اللہ کے ساتھ، جو بادشاہ واجد علی شاہ کے خاص نمبروں میں سے ہیں، قرب و انس حاصل ہے، میں دل میں سوچتا رہا ہوں اور کہتا رہا ہوں:

باشد کہ ہمیں بیخبر آمد پر و ہاں

غرض میرے دل میں طرح طرح کی ہوسیں تھیں اور مجھے یقین تھا کہ میرا احمد حسین، جو بھول میرے فرزند کے ہے اور سعادت مند ہے، جب نہیں کہ قطب اللہ کو اس پر آمادہ کر لے کہ میرا ذکر شاہِ اودہ واجد علی شاہ سے کریں اور دربارِ سلطانی سے میرے نام فرمان طلب بھجوائیں تاکہ میں لکھنؤ پہنچوں اور بادشاہ سے ملوں

اور اس طرح میری ناکامیوں کا دور ختم ہو۔ لیکن وہ ری غوبی قسمت کہ یہ خیالی منصوبہ ختم ہو کر رہ گیا اور تمام امیدیں مہل پہ پاس ہو گئیں اور ایسا ہوتا ہی تھا اس لیے کہ اقبال نکاح میر مہدی بھروسہ نے اپنے نام کا خط، جو تمہارا لکھا ہوا تھا، مجھے دکھایا۔ خدا جانتا ہے جو اس خط کو دیکھ کر میرا حال ہوا ہے اور دور تک اپنا اہتمام نظر آنے لگا ہے۔ آخر یہ کیا ہو گا کہ تم کو لکھنؤ سے ناکام ہو کر روانہ ہونا پڑے۔ براے خدا میں یقین میرے غم زدہ دل بے قرار کی چادر گری کر۔ تجھے خداوندِ قدیر اور امدادِ حقۃً امدادِ عظیم السلام کا واسطہ اپنا حال صحیح صحیح مجھے لکھ۔ جو کچھ تم نے میر مہدی کے خط میں لکھا وہ میرے تصور اور میری توقع کے بالکل برخلاف ہے۔ تعجب ہے کہ تم نے حالات مجھ کو کبھی نہیں لکھے۔ اب تمہاری جان کی قسم، جب تک تمہارا دوسرا خط میرے نام نہ آئے گا اور تمہارے حالات کی سرگزشت معلوم نہ ہوگی، میرے دل کو چین نہ آئے گا۔ خدا کے لیے جلد از جلد خط بھیجو اور اپنی کیفیت سو ہو لکھو۔

اے بہا آرزو کہ خاک شدہ

انکھارِ حزن و ملال اور طلبِ تفصیلی حال کے سوا کیا لکھوں۔

اسد اللہ تار سیاه۔

آخر کار غالب کا قصیدہ (غنن ز روئے رضواں بکوعے یاد کشد) قلمِ قدس کی وساطت سے بادشاہ کے دربار حاضر کیا گیا اور مشہور مرثیہ گو میر خیر ۱۲۵۵ھ نے غالب کی درخواست کے ساتھ بادشاہ کے حضور میں پڑھا۔ بادشاہ نے پسند فرمایا اس سلسلے میں مرزا جہادى الاول ۱۲۶۶ ہجری روزِ سرِ شنبہ (مارچ ۱۸۵۰ء) کو نواب محمد علی خان بہادر عرف میرزا حیدر ۱۲۵۵ھ کو لکھتے ہیں:

سر آغاز سالِ گزشتہ در عہدِ شاہِ انجم سیاه، پہر بارگاہِ حضرت

سلطانِ عالم قصیدۂ انشا کردم و عرضداشتی در نثر نیز رقم زدم و آں
 قصیدہ و عرضداشت بہ قلب الذولہ فرستادم۔ قلب الذولہ مردی
 کرد و قصیدہ و عرضداشت بظہر جہانیاں داراودہان درآورد۔ مولانا
 حمیر سلمہ اللہ تعالیٰ بفرمان کتبی خدیج آں قلم و نثر را پادارے کہ
 پھاری گھر ہاے شاہوار بر ہماط بزم افشاغند بہ پیش گاہ سریر
 سپہ نظر خواند۔ پسندیدۂ طبع بلبل شہریار افتاد و بہ قلب الذولہ
 فرمان رفت کہ بہ ہنگام دگر عرضداشت را دوبارہ بہ نظر گزارند تا
 منت بر جان ساکن نہم و بجا نژدہ فرمان دہم۔ ۳۶۵

مرزا نے ایک اور خط یاد دہانی کے طور پر نواب امداد حسین خاں امین الذولہ
 بہادر وزیرِ اعظم و اجد علی شاہ کو لکھا جس میں قصیدے کے سلسلے کے بارے میں متوجہ کیا
 تھا۔ خط میں اپنی عاجزی کا اظہار یوں کیا تھا:

خواہم کہ بد بختی آصف بہ سلیمان رسم۔ گداہیم نگاہ دار و مورد
 بہ آصف و گدا رہا بہ ارسطو و خود را بخداوند سپارد۔ نیز دولت و اقبال
 کہ سرچشمہ فروغ بے زوال است ابدی فروغ و جاودانی ضیا
 ہا۔ ۳۶۵

آخر کار غالب اپنے مقصد میں کامران و کامیاب ہوئے تھے اور انہیں ”دیر
 آید، درست آید“ کے مصداق اپنی کاوشوں کا صلہ مل گیا تھا۔ مجتہد العصر سید محمد کے وسیلے
 سے انہیں سلطانِ عالم و اجد علی شاہ کے دربار سے خلعت ملا۔ اس بارے میں ۵ نومبر
 ۱۸۵۹ء کے خط میں یوسف میرزا ۳۸۵ کو لکھتے ہیں:

سزا صاحب! تم جانتے ہو کہ میں ۱۳ پارچے کا خلعت ۳۶۵ ایک
 بار اور ملیک خاص شال و روبال دو شالہ کس کس کے ذریعے سے
 پا چکا ہوں۔ مگر یہ بھی جانتے ہو کہ وہ خلعت مجھ کو دو بار کس کے
 ذریعے سے ملا ہے، یعنی جناب قبلہ و کعبہ مجتہد العصر مدظلہ العالی۔

اب آدمیت اس کی حقیقتی نہیں ہے کہ میں بے اُن کے قنط کے
 مدح گستری کا قصد کروں، چناں چہ قصیدہ لکھ کر اور جیسا کہ میرا
 دستور ہے، کاغذ ہوا کر حضرت بی و مرشد کی خدمت میں بھیج دیا
 ہے۔ یقین ہے کہ حضرت نے وہاں بھیج دیا ہوگا اور تم کو لکھ چکا
 ہوں کہ میں نے قصیدہ لکھو کو بھیج دیا ہے۔ اسی خط میں یہ بھی تم
 کو لکھا ہے کہ حضرت زبدۃ العلماء سید تقی صاحب اگر نکلتے بھیج
 گئے تو مجھ کو اطلاع دو۔ ۱۷۵۷

مرزا کی تحریروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لیے واجد علی شاہ نے
 پانچ سو روپے کا سالانہ وظیفہ منظور کیا تھا۔ چناں چہ چودھری عبدالغفور سرور کو ایک خط
 میں لکھتے ہیں:

واجد علی شاہ بادشاہِ اودھ کی سرکار سے بہ صلۃ مدح گستری پانسو
 روپے سال مقرر ہوئے۔ وہ دو برس سے زیادہ نہ جیے، یعنی
 اگرچہ اب تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور چالی دو ہی برس
 میں ہوئی۔ ۱۷۵۷

واجد علی شاہ شعبان ۱۲۷۰ ہجری (اپریل ۱۸۵۴ء) میں بیمار تھے۔ انھوں نے
 خواب دیکھا تھا جس کا تفصیلی ذکر انھوں نے اپنی مشہور ”حقیقۃ نامہ“ کی ۱۸۵ ویں
 داستان میں اس عنوان سے کیا:

در بیان دیدن رویاے صادقہ و عتباتِ ترمیمِ مقبرہ از

ابا عبد اللہ الحسین علیہ الصلوٰۃ والسلام

ذیل میں چند اشعار درج کیے جاتے ہیں:

ہزار و دو صد اور ہفتاد سال

یہ تھا اُن دنوں سالِ ہجرت کا سال

نہیں شک ذرا یاد ہے مجھ کو سب
 رہ شنبہ تھا اکیسویں کی تھی شب
 ہوئی منعقد ایک ۱۳۳۵ ۲۷؍ عزا
 مقام عزاے حیدر کربلا
 اسی مجلس خاص میں ایک بار
 جب قدرت حق ہوئی آشکار
 شخصیں بھی آئیں نظر دو وہاں
 کہ تھیں وہ نہایت رنگ و کلاں
 کہ دو تاج آئے پتھپ تمام
 عطاے خدا یا عطاے امام
 ضریح مبارک کا گنبد تھا جو
 ہوا نصب اس پر وہ تاج ایک تو
 رہا تاج پرتوور جو دوسرا
 سرے سر پہ وہ نصب ہونے لگا
 کبھی اہل مجلس کی حیرت ہوئی
 کبھی دنگ مطلق دیانت ۱۳۳۵؍ ہوئی
 ہوئی بعد اس کے جو مجلس شروع
 ہوا ایک سانچے کا بحر وقوع
 یہ دیکھا کہ ہیں جمع میرے بزرگ
 انھی میں ہیں مریم مکانی ۱۳۳۵؍ سترگ
 ہوا میرے دل کو یہ اس دم گماں
 کہ دہرا ہیں روتی فزائے مکاں

کہیں ہیں جناب شر مشرقین
 شہنشاہ دنیا و عجبی حسین
 پڑھا مرثیہ میں نے بخش خراج
 ہوئی بات ثابت یہ مجھ پر صریح
 کہ خاتونِ محشر ہیں روتی فزا
 مری ہندہ مریم مکانی کی جا
 یہ مجلس میں رونے سے غوغا ہوا
 کہ ہنگامہ حشر برپا ہوا
 غرض روز کہتے جو آخر ہوئے
 تو آثارِ تعمیر ظاہر ہوئے
 کہ آیا خطِ صاحبِ اجتہاد
 کہیں کر بلا میں ہیں جو خوش نہاد
 محمد تقی نام، بحرِ اعظم
 گلِ بارغِ اسلام بحرِ اعظم
 یہ مضمون کہ تھا میں نجف میں کہیں
 شر قبلہ شاہ دنیا و دیں
 بڑا فضلِ ربِ توانا ہوا
 مجھے خواب میں حکم مولا ملا
 کہ جا کر بلا میں ہو چندے کہیں
 مقبرہ مقدس ہے وہ مرز میں
 بنا تہجِ پاک سے اک خراج
 کرے اہلِ امراض کو جو کج

سوے ہند بھیج اس کو مہدی کے ساتھ
وہ سید ہے، لے جائے گا ہاتھوں ہاتھ
غرض بارہویں تھی میرے سوم کی
خبردار نے یہ خبر مجھ کو دی
بنی ہے دیانت کی جو کربلا
وہیں ہے ضریح مقدس کی جا
دیا مابدولت نے فرماں یہ جب
کہ جائیں دلی مہدی عالی نسب
عزیز اور کذاب صاحب بھی جائیں
اراکین دولت مصاحب بھی جائیں
جلوس سواری بھی ہو ہے شمار
علم، فضل، ذکا، شہر، راہوار
روانہ ہوں سب ڈاکترین امام
عزادار بھی سینہ زن ہوں تمام
سہ پیش ہر ایک انساں ہوا
محرم سے بھی بڑھ کے ساماں ہوا
غرض کربلا سے در خاص تک
زمن پر تھے انساں، ہوا پر ملک

واجد علی شاہ کو خواب میں چناب سید الشہداء کی طرف سے بشارت ہوئی کہ ہم
خاک شفا کھمارے لیے بھیجتے ہیں۔ نجیب اشرف کے مجتہد کو بھی بشارت ہوئی کہ خاک
شفا لکھو بھیجی جائے۔ کربلا سے خاک شفا کی ضریح بڑے احترام سے روانہ ہوئی۔ لکھو
میں جو داغ کی تاریخ تھی اس روز واجد علی شاہ نے سلطان اعلیٰ کو رات کو کھانا کھا کر میں
بہت عارضی شخصان زیادہ روی کی طاقت نہیں رکھتا اس لیے ولی مہد اور دیگر شہزادوں کو

نعم دیا گیا کہ وہ ۲۶ شعبان ۱۲۷۰ھ (مئی ۱۸۵۳ء) یوم پنج شنبہ آدھ گھڑی دن رہے سیاہ پوش ہو کر دیانت لفظ کر بلا میں حاضر ہوں۔ اس نعم کے موافق خراج خاک شفا بڑی دھوم سے لکھنؤ میں آئی۔ ۱۲۷۰ھ

خریج مبارک کے ورد لکھنؤ کی تائید مرزا غالب کے ایک قصیدے سے بھی ہوتی ہے جو کلیات غالب میں ”قصیدۂ خریج“ کے نام سے موجود ہے۔ خریج اور قصیدے کی حریدہ تفصیلات حافظ احمد علی خاں ناظم کتب خانہ رام پور کے مضمون ”مرزا غالب کے ایک قصیدے کی شاہانِ تصنیف“ مطبوعہ ”معارف“ دارالاستغنین، اعظم گڑھ بابت مئی ۱۹۳۲ء (صفحہ ۳۶۳) میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ قصیدے کی تحویب واقعہ کر بلا کی خوں پناں تصویر پیش کرتی ہے۔ چند شعر یہ ہیں:

بیا وہ کر بلا تا آں ستم کش کارواں بنی
کہ وہ دے آدم آلِ عبا ما سارہاں بنی
نہاشد کارواں را بوجِ قدرتِ دخت و کالاے
ز بارِ غم بود کر تاقہ را بھل گراں بنی
نہ بنی سرخوشِ خوابِ عدمِ عبا کی غازی“ را
نہ مقلش وہ غم بازو، نہ حیرش وہ کماں بنی
نہ ی بنی کہ چل جاں داد از بیداو بدخواہاں
علی اکبر کو بچوں عجب بدخواہش جوان بنی
کر غم کاہں ہم بنی ولے داری و چشمے ہم
بنوں آغوشِ بازو بیکرِ اصغر چہاں بنی
چہ اعداں وہ بکرِ افروزہ ہاشی کا اعداں داری
حسین ابنِ علی را وہ ہمار کشکشاں بنی
سمے داکش وک بگل خار بودے، بر زمیں پانی
سرے داکش ز افسر خار بودے، بر ستاں بنی

یہود تا بھکیے گاہ ناز آسروش چڑہاں را
 خرمیے سوے ہند از خاک آں شہد رواں بنی
 ضیائے زان زیارت گاہ بر زوے زمیں بارو
 کہ خاک لکھنؤ را مردم چہم جہاں بنی
 مگر وہ خواب دادند آگہی سلطانِ عالم را
 کہ سوے شاہ از قوش شہنشاہ ارمقاں بنی

غالب نے یہ قصیدہ لکھنؤ کے مجتہد المصنوع سلطان احمد سید محمد قبلہ کو ان کی
 امداد کے لیے بھیجا۔ انھوں نے ذیل کی سفارش کے ساتھ اسے سلطانِ عالم کی خدمت
 میں پیش کیا:

سلطانِ عالم خلد اللہ ملکہ

ازاں جا کہ آوازۂ وصول بشارت موصول مبارک خاکِ شفا
 از کربلائے معلیٰ برائے ہندوگانِ اقدس و اعلیٰ از ہیبتِ السلطنت
 ہمیشہ آباد تا دارالخلافت شاہجہاں آباد رسید، اسد اللہ خاں غالب
 دہلوی کہ در فنی شعر و سخن یکتا، در فصاحتِ نظم و نثر بے ہمتا و مہمتا
 نظیری نظیرے نداد۔ اگر کلامش مقبولِ بارگاہِ خاقانی شود، پایۂ
 خاقانی باشد۔ دریں ولا قصیدۂ غرا در مدحِ خرمی بطرز فصیح و بیان
 فصیح انکا مودہ و جاہ مدحت گری و شاکستی ہندوگان سکندر شاہ را
 بقدم اقدام مودہ بہ مفاد۔

ملکہ جاہت برجل من جواد

تو سلیمانی کن، اے عالیِ نزاد

...کہ بعد قبولِ عقدِ سوگند ہی کروں، بخیر و معلیٰ گز مانید۔ لہذا دای
 کہ در امورِ خیر ساری ہی باشد، بارگاہِ ملک جاہ آں را ارسال
 داشت: مگر قبولِ عقدِ سوگند و شرف۔ وچوں حصصن مرشد و اشعار

مکہ ہے۔ غالب کہ ہمدانی شریفہ کہ در حلیہ ثواب
 بکا و باکی دارد گشت، فقر اللہ ذوبہ ولو کانت مثل۔ باعث غم و
 غمراں لغزش قدم و لغزش قلم کہ در مثنوی ۳۶۵۳ سابق لائق حالش
 شدہ بود، گرد۔ رجاے واثق کہ ہمارہ ماوج ممدوح مورد مرام
 سلطانیہ و عنایات خاقانیہ از چشک و تمناہ بودہ باشد۔ دامنہ خورشید
 محدث گستری از مطلع عتاب خسروی طالع و لامع باد۔ ۳۶۵۴

سلطان العلماء کی سفارش پر بادشاہ نے غالب کو خلیفہ فاخرہ عطا کی، لیکن
 سلطان العلماء کو خیال ہوا کہ دہلی کے بادشاہ اور شاہی خاندان سے غالب کے حسنات
 ہیں۔ کہیں اس عہدے کا بھیجا بادشاہ کے حراج کے خلاف نہ ہو اور یہ بات غالب کے
 مقررہ وظیفے کی برہی کا باعث نہ بن جائے۔ اس خیال سے انہوں نے توقف کیا اور
 غالب کو لکھا کہ اب آپ جو مشورہ دیں، اس پر عمل کیا جائے۔ اس مضمون کا خط جو
 سلطان العلماء نے ۱۲۷۰ ہجری کو غالب کے نام بھیجا تھا، ذیل میں نقل کیا
 جاتا ہے:

مشہود خاطر توذد آثار باد کہ بیشتر در پارچ عمیقہ ایقہ مکتوب مشر
 بر ایصال محروضہ مع قصیدہ فریدہ بہ پیشکاه سلطانی نوشتہ ارسال
 داشتہ ام۔ مقدمہ البتہ کہ بظہر شریف رسیدہ باشد و دیگر پانچوں
 ہوز نہ رسیدہ۔ بالفضل امر تازہ کہ قابل انہار است اس میں کہ قصیدہ
 موصوفہ کہ حصص و ذر غرر آب دار ولایتی محتالی شاہوار بود۔ خلیے
 پستو خاطر مبارک ہندگاں دارادہاں افتاد۔ تشریح قبول بہ بیج
 معمول است۔ یا اعطائے ارسال خلیفہ فاخرہ از بارگاہ
 سپہر اشتہار صادر شد۔ لہذا خیال اس میں، چون کہ آں ناظورہ ہستانی
 خدائی ہا ہمہ نورمان صاحبزادہ در صحت اورنگ گورگانی مطلق و
 توشعہ دارند، مہابا الجارح اس عہدے شریفہ عتاب حراج آں بادشاہ

نچاد و باصیغہ برہمی و خلیہ مقررہ سائی شود، لہذا دریں باب توقف
ممودہ شد۔ الحال انچہ مشورہ سائی گرای باشد، بعلل آید... بمن شہر
ذیقعدہ ۱۲۷۰ ہجری۔

اس خط کے لکھانے پر چنے کے طور پر حسب ذیل تحریر درج تھی:

بحوذ و صعود تعالیٰ در شاہجہاں آباد صیغہ عن الفساد، باطل
سعادت شہل، خاں صاحب دالامناقب، عالی مناصب، فارس
میادینِ سنخوری، ماسی کارنامہ خاتائی و انوری، عجم مذول،
دیورالملک، اسداللہ خاں غالب بہادر، نظام جنگ زاو مداح
مفتوح باد۔ ۲۸

واجد علی شاہ جب ۶ فروری ۱۸۵۶ء کو تختِ سلطنت سے معزول کر کے کلکتے
میں نظر بند کر دیے گئے تو مرزا نے نظر بندی کے زمانے میں بھی ان کے ساتھ مالی امداد
کے لیے رابطہ قائم رکھا تھا۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ بادشاہ کی طرف سے کچھ ملتا تھا کہ
نہیں۔ انھوں نے جو قصیدہ (شادم کہ گردشہ بسرا کرد روزگار) بادشاہ احمد علی شاہ کے
لیے لکھا تھا، اور جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، وہی واجد علی شاہ کی خدمت میں کلکتے بھیجا۔
اس بارے میں یوسف میرزا کے نام ۲۸ جمادی الاول ۱۲۷۰ ہجری مطابق ۲۸ نومبر
۱۸۵۹ء کو کلکتے کے چنے پر ایک خط میں لکھتے ہیں:

یہ قصیدہ مدوح کی فکر سے گزرا نہ تھا۔ میں نے اسی میں احمد علی
شاہ کی جگہ واجد علی شاہ کو بٹھا دیا۔ خدا نے بھی تو یہی کیا تھا۔
انوری نے بارہا ایسا کیا ہے کہ ایک قصیدہ دوسرے کے نام پر کر
دیا۔ میں نے اگر باپ کا قصیدہ بیٹے کے نام کر دیا تو کیا غضب
ہوا، اور پھر کیسی حالت اور کیسی مصیبت میں، کہ جس کا ذکر
بطریق اختصار اوپر لکھ آیا ہوں۔ اس قصیدے سے مجھ کو عرض
دیکھا و سخن منظور نہیں، گدائی منظور ہے۔ بہر حال، یہ تو کہو، قصیدہ

پہنچا یا نہیں پہنچا؟ پرسوں تمہارے ماموں کا خط آیا۔ وہ قصیدے کا پہنچنا کھتے ہیں۔ کل تمہارا خط آیا۔ اس میں قصیدے کے پہنچنے کا ذکر نہیں۔ اس تفرقے کو مٹاؤ اور صاف لکھو کہ قصیدہ پہنچا یا نہیں۔ اگر پہنچا تو حضور میں گزرا یا نہیں۔ اگر گزرا تو کس کی معرفت گزرا اور کیا حکم ہوا۔ یہ امور جلد لکھو۔ برقعہ ملی، پہلے سے نیت میں یہ ہے کہ جو شاہِ اودھ سے ہاتھ آئے، حصہ برادرانہ کروں۔

نصف حسین میرزا اور تم اور بچاؤ۔ نصف میں مطلقوں کا عدار۔ ۳۹۵۳

مرزا غالب اپنی ناکامی کا ذکر ۱۲/۱۳ اپریل ۱۸۶۱ء کے خط میں نواب

علاء الدین خاں ملائی کے نام میں کرتے ہیں:

مجھ کو اس دنم نے گھیرا ہے کہ میری خوشحالت کی تاثیر تھی۔

میرا محمود بیٹا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ تھیں

قصیدوں کے منتحل ہوئے، مگر نہ منتحل کئے۔ ۵۰۵۳

غالب کو واجد علی شاہ سے بڑی امیدیں تھیں۔ انہوں نے بادشاہ کی کتاب

”بست وخت افر“ پر امداد اور صلے کے ناتے سے دیباچہ بھی لکھا جو نکلیاتِ غالب

ص ۱۰۸ میں ”دیباچہ نثر موسوم بہ بست وخت افر، تصنیف حضرت فلک رفعت شاہ

اودھ“ کے نام سے درج ہے۔ مرزا نے اس تصنیف کے یہ دو تاریخی نام تجویز کیے تھے:

”نثر اعظم“ (۱۲۷۱ھ) اور ”ریاضِ ملک معنی“ (۱۲۷۱ھ) دیباچہ منکوم مشہوری میں ۳۳

شعر پر مشتمل ہے۔ چند شعر یہ ہیں:

بنام ایذا، رہے مجموعہ راز

تکلفتِ آذر تر از نیرنگ و اعجاز

تعالیٰ اللہ کتابے مستطابے

خطِ کفعم فرداں آفتابے

پری پروانہ شمعِ عالم افروز

سو روشن شبِ ولے روشن تر از روز

بیاضے کاندہاں میں انستور است
 تو کوئی موسے از دریائے نور است
 ہاتھ جم چشم، سلطانِ عالم
 ہم آئینہ ارکانِ عالم
 مزد کہ ”نیر اعظم“ نمی نام
 کہ از تامل بر آید سالِ اتمام
 دگر بایہ از یہی خوشتر گہر سست
 ”ریاضِ ملکِ مستی“ ی توں گفت
 کس بحر بھلے مای دیں
 دعا از غالب و از خلقِ آئیں
 شہنشاہِ را حیاتِ جادواں باد
 بہارستانِ جہاں بے غزاں باد



حواشی اور حوالے

۱۵۷ موبھلے، ایک جہں، دلی میں پیدا ہوئے تھے۔ بعد میں دلی چھوڑ کر اکبر آباد میں جا رہے۔ پھر مجدد آباد
 چاکر نواب نظام علی کے ذکر ہوئے۔ اور تین سو سوار جمیت کے عہدے دار رہے۔ کئی برس تک وہیں
 قیام کیا۔ اس کے بعد اودھ میں رہا، پھر لاہور کے قیام ہوئے اور وہیں کئی لڑائی میں مارے گئے
 (”ادوے مستی“، حصہ اول، سلجی پبلی، دلی، ۱۸۹۹ء، ص ۳۶)۔ اور راج گڑھ میں بہرہ خاک
 ہوئے۔ یہ مقام ۱۸۰۲ء کا زمانہ تھا۔ غالب لکھتے ہیں:

دلی میں کہ گفت گہر میں وہ جہاں خیم
 دلی میں کہ کھڑے تھے چاروں پہ کارزار
 وہ جگہ ساگی شدہ ہم چاکر حضور
 تھیں علی مراد و دہریہ بکھیرے خود

کافی یہ مطالعہ، شاہ ضرور محنت
در خاک راج گڑھ پدم را بد چرا
(غلیاتِ غالب، ص ۳۱۵)

۳۵۱ غازی الدین حیدر: ۱۹ سہیل کی مرضی لوہ سہادت علی خان کے انتقال کے بعد ۲۴ ربیع ۱۲۳۹ھ مطابق ۱۸۵۴ء کو مسو وزارت پر پہلے ("تاریخ نادرہ ص ۱۸۲، صفحہ ۱۸۳) لکھنؤ، مطبوعہ ۱۸۶۳ء) موصوف نے ۱۸ دی الحج ۱۲۳۹ھ (۱۸۱۸ء) کو مسو وزارت سے الگ کر ہودہ کے کتبِ سلطنت پر بلوی کیا اور شاہ دشمن کے خطاب سے مرزا ہوا۔ ۲۷ راج الاول ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ اپنے حقیر کردہ نام ہارے شاہ نجف میں دفن ہیں۔ تاریخ نے تاریخ کیا:

گفت تاریخ سرخ استاد
اے بہا آرد کہ خاک شدہ ۱۲۳۳ھ
(دیوانِ تاریخ، ص ۱۶۹)

۳۵۲ نام سید محمد عرف آقا میر، خطاب صفہ لہذا دار الملک خلیفہ بیگ۔ اصل تلمیذی تھے۔ بڑے ذہین اور ہوشیار، مسلط ہودہ کے سپرد و سیاہ کے ناگ تھے۔ فیصلہ دین حیدر بادشاہ نے ان کو ملک بد کیا۔ آخر میں کان پور میں ۵ دی الحج ۱۲۳۷ھ مطابق ۷ مئی ۱۸۲۲ء کو انتقال کیا۔ تاریخ نے تاریخ کیا:

لا کاب خلیفہ بیگ امرد
گذاشت از در کافی تا کہاں ہاے
دستم سال چرخ وفاق
دشمنہ بیگم دی چہ اے داسے
(دیوانِ تاریخ، ص ۱۶۹)

۳۵۳ غلیاتِ نثر، غالب، ص ۱۵۷

۳۵۴ "تاریخ غالب"، ص ۲۵

۳۵۵ غلیاتِ نثر، غالب

۳۵۶ دیوانِ غالب، لکھنؤ، مرقی، ص ۱۱۹

۳۵۷ اظہار، ص ۲۵

۳۵۸ داسے بیگ لہ، مرقی عمارت گھر شاہزادہ غالب کے والد تھے۔ داسے صاحب کے نام غالب کے کئی قاری غزل غلیاتِ نثر میں چھپ چکے ہیں۔ ان غزلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی ان سے بڑی پرانی دوستی تھی۔ بیگ لہ کا انتقال ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰-۶۱ء) میں ہوا۔ غالب نے تاریخ کیا:

گوید داسے بیگ مل شیریں کلام فرد
درین دوست مدت ازینا نکلا، درین
تسلیم کے ذ سال وفاق نشان دہ
غالب شفیق و محنت چہ گویم، "بہا درین"
(تاریخ وود، ص ۱۵۷)

۳۵۹ غلیاتِ نثر، ص ۱۵۷

۳۶۰ غازی الدین حیدر (۱۸۵۷-۵۷ء) علم دوست ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھے۔ انھوں نے

غزلوں کے علاوہ اہل صنف کی تحریف میں قصیدے بھی کہے ہیں۔ ڈاکٹر اظہار گرنے نے ان کے اشعار دیکھ کر ڈاکٹر ("اودھ کٹیاگ" ص ۶۸) کیا ہے۔ بادشاہ نے "نصرت غلام" کے نام سے سات جلدوں میں ایک ضخیم لغت بھی مرتب کیا تھا۔ اس کی جلد اول و جلد دوم ۱۲۳۶ھ میں اور باقی پانچ جلدیں ۱۲۳۷ھ میں مطبع سلطانی کھنڈ میں چھپی تھیں۔ تصانیف کے لیوٹا خط بہ راقم کا حصول: "نصرت غلام"، "مطبوعہ" "سمیعہ"، لاہور، ۱۹۷۷ء۔

۱۲۵۵ھ نصیر الدین حیدر: اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے اور بادشاہ مجلس کرتے تھے ("دوسر نام"، میر محمد امیر علی خاں، مطبوعہ ۱۳۹۲ھ، ص ۶۹: "تذکرۃ روز روشن"، ص ۲۸: "علم خات جلدیہ"، جلد دوم، ص ۶) پروفیسر مسعود حسن رضوی کے کتب خانے میں بادشاہ کی حدود غزلیں ایک محفوظے "مجموعہ غزل" میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر اظہار گرنے ("اودھ کٹیاگ" ص ۶۸) نے ان کے قصائد کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے ان کے مصنفین کی مدح میں کہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے قصائد کا جو مجموعہ دیکھا تھا، وہ ۶۰۰ صفحات پر مشتمل تھا اور محفوظے کی صورت میں فروغ بخش کتب خانے میں موجود تھا۔ بقول اظہار گرنے نصیر الدین حیدر مرتبہ بھی کہتے تھے اور مرتبے میں علی حیدر یا علی گھس کرتے تھے۔ ان کا مجموعہ مروی توپ خانے میں موجود تھا۔ بادشاہ کا انتقال ۷ جولائی ۱۸۳۷ء کو ہوا اور اپنی بیوی ہوئی باکمل کر لیا میں، گوشتی کے پادہ حشمت شہید آگری کا بیٹا، دفن ہیں۔ ("نصرت غلام"، ص ۶۷: "روز روشن"، ص ۲۸) رنگ گھنڈی نے تاریخ کیا:

کجا باب مہدی دی جاہ
کجا حشمت و جاہ اجل آں
شہ مرقش گزراے جدہ
رہے عزت و جاہ اقبال آں
دھیم مسورع بادشاہ غمت
انہی حلقاے بر حال آں

(دعایہ رنگ، مطبوعہ ۱۸۳۷ء، ص ۳۸)

۱۲۵۵ھ کتابت غالب (علم)، ص ۳۵

۱۲۵۵ھ نصیر الدین حیدر غائب اظہار غزلیں میں تاریخ الامتداد تھے اور امام مہدی آثار اہل ان کی حاجت سے خود کو "باب مہدی" کہتے تھے۔ ذیل کا شعر سننے پر کہہ دیا:

مے دو برسم و زور از فضل حق علی ہا
باب مہدی نصیر الدین مہدی بادشاہ

("معارف اور تاریخ" از ولیم کل، مطبوعہ ۱۸۶۷ء، ص ۳۸۵)

۱۲۵۵ھ نواب روشن قزاق: میر حسین خاں نام، عرفیت مرزا تھا۔ نواب اشرف علی خاں کے بیٹے تھے۔ نواب حکیم مہدی علی خاں حکیم قزاق ("عقبات" ص ۱۸۳۷) کی مسودہ کے بعد ۳ جمادی الثانی ۱۲۳۸ھ (۱۸۳۲ء) کو نصیر الدین حیدر کے دربار میں تھے ("نصیر الدین حیدر"، جلد اول، ص ۳۲۸) روشن قزاق بہادر کا انتقال ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۴-۵۵ء) میں ہوا۔ فقیر شہزاد آبادی نے تاریخ کیا:

روشن قزاق بہادر فرزند
دور شد نام مرزا ہے ہے حلیہ

بادشاہاں پہ عشق و شمع
تہاں اسرا ہے ہے حیف
گفت نمود و ذرات ہے نور
چہ شہ آں جہ و غما ہے ہے حیف
ہر علم حضرت کاتب ہما
ہر زبان دلہ ما ہے ہے حیف
مکرم اہی صریح تاریخِ حقیر
ہے فکرِ نور را ہے ہے حیف = ۱۲۶۹ھ

(”عزم الاشد“، ص ۲۲۷)

۱۲۵۵ جہاں علی خان: ان کا اصلی وطن دہلی تھا۔ وہاں سے گھسوا آئے۔ پھر کئی سی و سٹارٹ کے اپنی ذاتی قابلیت سے نازی الدین حیدر بادشاہ کے ابتدائی مقرر ہوئے اور عہدِ حکومت سے بہت دشمنی قائم ہوئی۔ ان کا خاندان سلاطینِ اودھ اور برطانوی عہد میں سوز و غملا رہا تھا۔ تفصیلی حالات ”ڈائری“ میں درج ہیں۔ بادشاہ نازی الدین حیدر موصوف کا ہے کہ احرام کرتے تھے۔ انہوں نے وزارت میں کوئی عہدہ قبول نہیں کیا تھا۔ انہی کی سٹارٹ سے آقا میر دادر ہو گئے تھے۔ ان کا انتقال ۱۳۶۳ھ (۱۸۴۷-۱۸۴۸ء) میں ہوا۔ میر شوہر آبادی نے چارچنگ کیا:

صدرِ رسل جہاں علی خان کے سبب
کہتے ہیں بیٹ کے سب اہلِ معنا ہے ہے دے
مخلوق و علمِ کام و لب و لہجہ
کہتے ہیں ہو گئے ہم نے سر و پا ہے ہے دے
میر و دولت دی ہو گئی عالی۔ انہوں
آج ہے کس ہیں ملک و اسرا ہے ہے دے
زبِ اطراے چہاں ہو گئے وہ گھنٹی نہیں
خاک ازانی ہے یہاں باز جا۔ ہے ہے دے
مجھ سے رضاں نے کہا صریح تاریخِ حقیر
تو دہر عدا نکھڑا ہے ہے دے

۱۲۵۶ کاپتہ نثر، ص ۱۱۶۔

۱۸۶۵ اظہار، ص ۱۷۹۔

۱۹۶۵ حقو کے حیلے میں ”حقو اور اودھ انصار“ دیکھیے۔

۲۰۶۵ مظفر قزوین: غالب کے بزرگ دوست نواب حاتم الدین حیدر خاں قاقی کے بڑے صاحبِ زادے تھے۔

ان کا نام میرزا سیف الدین خاں بہادر عرف کاتب مظفر قزوین سیب بنگ نامہ الکتاب۔ خود میں

کرنا کاہن میں لکھی ہے کہ دے گئے۔ مظفر قزوین کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو ”غالب“ کے ایک مکتوب

الہ سنہ ہجرت میرزا ناصر گھنٹی ”مطبوعہ“ ”دہلی زبان“ دہلی، عمارتِ نیم جلوی و ۸ جولائی ۱۹۹۷ء

۲۱۶۵ ”سمرقند سے سنی“، جلد اول، مطبعہ چھاپائی، دہلی، ۱۸۹۹ء، ص ۳۹

۲۲۵۵: امجد علی شاہ: سلطانِ عالم و امجد علی شاہ کے والد گرامی ۲۳ سال کی عمر میں ۵ ربیع الاول ۱۱۵۸ھ کو فوت ہوئے ("ذریعہ عامہ"، ص ۸۳)۔ "بیچ داورنگ مبارک بیٹا" سالِ بلوی ہے۔ انجا درہے کے پانچو موسم دستگیر تھے۔ ان کا انتقال ۳۶ ستمبر ۱۲۶۳ھ (۱۲ فروری ۱۸۴۷ء) کو عمر ۲۸ سال پانچ ماہ اور بارہ دن ہوا۔ امیر نے تاریخ کیا:

شاہ عادل، نیک طینت، نیک سیرت، نیک خو
دک دنیا کرد و در دہا لیلیاں شد حق
از سرشار غیب پرہیزم چہ تاریخِ وقت
گشت، شد امجد علی جنتِ مکانِ حاصل کن
(مختصر دیوانِ امیر)

۲۲۵۶: شفیق محمد سہالہ علی خاں نام: چاہ نگہ، انوارِ فخر و خطاب۔ ان کے والد افضل اللہ شاہ امجد علی خاں بہادر عرف میر خان تھے۔ نواب غازی الدین خاں طلب نظام الملک آصف جاہ کی اولاد میں سے کابلی کے رہنے والے تھے۔ پہلے سید امجد علی خاں اور بعد میں قاجار سے مشورہ کیا۔ "بخارہ فیض" ایک تری رسالہ اور دیوان اور ایک شہوی یادگار ہیں۔ ان کی تصانیف نادر و کم باب ہیں۔ شہوی کا ایک مطبوعہ نسخہ میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ ۱۸۸۱ء مطابق ۱۲۹۸ھ میں انتقال کیا۔ ("مطالعہ قاجار"، ص ۱۷۱)

۲۲۵۷: "امرد سے سنی"، ستمبر ۱۳۳۳ء

۲۲۵۸: میر احمد حسین نیکنش: شاگردِ قاجار۔ نیکنش نے قاجار کی امداد کے لیے واپس علی شاہ کے دربار میں بڑی کوشش کی تھی۔ زیادتِ قدر میں لکھنؤ میں بارے گئے تھے۔ ان کے ہنگامہ حالات "بارغ دو در" کے تصانیف میں وزیرِ اہلن حادی نے لکھے ہیں۔

۲۲۵۹: بارغ دو در، ص ۵۷۷

۲۲۶۰: بارغ دو در، تحقیق دسمبر ۹۱

۲۲۶۱: قطب اللہ: علی خاں نام تھا، دہلی کے گوتے تھے، جامدین اب بھی دہلی میں موجود ہے ("قاجار"، نظامِ رسولِ قرص ۲۱۶)۔ لکھنؤ آنے تو سلطانِ عالم و امجد علی شاہ نے مروج بخارا اور قاجار قطب اللہ کے خطاب سے ترسوا کر کیا۔ وہ بادشاہ کے خاص صحابہ میں سے تھے۔ اس خط سے قاجار کی مجلس اور مجبور کی پراساسی روشنی پڑ سکتی ہے۔

۲۲۶۲: بارغ دو در، تحقیق دسمبر ۸۷

۲۲۶۳: بارغ دو در، تحقیق دسمبر ۹۱-۹۲

۲۲۶۴: نواب امین اللہ: وہ پہلے امجد علی شاہ بہادر کے دربار تھے۔ ان کے انتقال کے بعد واپس علی شاہ کے دربار آئے۔ موصوف بنے دیوان، پانچ شرح اور خاندانِ امجد کے متعلق تھے۔ انکے آپاد کی بنیاد انھیں نے لکھنؤ میں ڈالی تھی۔ اس کے علاوہ کربلا سے میر خاں کے حاصلِ حجازی علم واد کے مرتد کی شیعہ کی بنیاد ۱۲۶۶ھ (۵۰-۱۸۳۹ء) میں بہار و امجد علی شاہ ڈالی تھی۔ نواب امین اللہ کا انتقال ۱۸۵۶ء میں واپس علی شاہ کے زمانے میں ہوا۔ اپنی کربلا میں ڈالی ہیں ("تھیر انوار"، جلد دوم، ص ۱۵۵)

۲۲۶۵: نواب حسین بہار: نواب حسین بہار عرف سید ذوالفقار الدین نام۔ نواب مظفر اللہ مرحوم کے

پہرے بھائی ہے۔ ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ لہد میں انہوں نے بڑی تعلیمیں حاصل کیں۔ ۱۸۰۶ء (۱۸۸۹ء) میں انتقال کیا۔

☆ ۳۳ مقتداؤں اور دیگرہ سلطانی عالم راجہ علی شاہ کے مصاحبین میں تھے۔
☆ ۳۳ حیرتیں، سید مظفر حسین نام، راجا لوب میں میر خیر کے نام سے مشہور ہیں۔ بھول سکتی، میر خیر نے مرثیہ گوئی میں نام پیدا کیا تھا۔ تصانیف کے لیے راجہ کی کتاب ”میر خیر: تعلیقی مطالعہ“ ملاحظہ ہو۔ خیر کا انتقال ۱۸۵۲ء (۱۸۵۵ء) میں ہوا۔ مرزا حاتم علی بیگ خیر نے سرکاری و عیسوی میں تاریخیں لکھیں۔
(”مطالعہ مرثیہ“، سال: تصنیف: ۱۳۹۷ھ، ص ۲۵۱)

مرثیہ گو چاہ میر خیر
جن کا شہرہ بجاں میں ہے ہر سو
قا مظفر حسین نام ان کا
راکب را کہ شہرہ شدہ ہو
اور مذہب حیدر کرد
دل دلائے علی سے قا ہو
سوئے جنت گئے جو وہ اسے میر
خانہ فکر کے لیے آئے
بھری و عیسوی لکھی تاریخ

چا کے حیدر سے لے میر خیر اب تو = ۱۲۷۲ھ
چا کے حیدر سے لے ۱۸۵۵ء

☆ ۳۵ لوب میرزا محمد علی خان نام، عرف آقا حیدر، خطاب ولیرقاؤں، قیروز بیگ خان، بہادر۔ رئیس اعظم لکھنؤ۔ میرزا محمد علی خان ترقی ملی بیگ کے بیٹے تھے۔ صاحب دیوان شاعر اور برقی کے شاعر تھے۔
ان کا مکتوب دیوان چار و دم باب ہے۔ ایک نسخہ سلطان آباد میں لکھنؤ میں تھا۔ ادا جانے۔ وہ اب کہاں ہے۔ ولیرقاؤں کا انتقال ۱۲۷۰ ہجری میں ہوا۔ دیوان امیر لکھنؤ، مکتوبہ ۱۸۹۷ء، (ص ۳۸) میں تاریخ دیتے ہیں:

ولیر سے کہ از دہشت بود شہرت
شہرے کہ مشہور بہ نام حیدر
تاریخ تو حق عا کرد ہاں
کہ جا یافت حیدر قرب بکیر

☆ ۳۶ گلیات عز غالب، ص ۳۸

☆ ۳۷ لکھا، ص ۳۵

☆ ۳۸ یوسف میرزا کے تعلیمی حالات کے لیے ملاحظہ ہو راجہ حروف کا مضمون ”دہلی زبان“ جی دہلی نارتھ کیم جونی ۱۹۹۷ء۔

☆ ۳۹ غلط، پیشہدہ مہار کہ شاہد است شعلی راکر بادشاہان ہندوستان حمایت ی کنند۔ روز اقبال دستار پر سر پہنچا، چاند پر پائے چاند پیشہدہ و کمر بند و گردن انوار شکوہ شکوہ و ۲۰ سے روز پہنچیں آئیں۔
لکھنؤ کی آید و پائے آں جے سے دیگر کی پیشہدہ و غلط سے دوجہ وارہ۔ دوجہ اولیٰ عشق پار چہ پی ہاں،
تھا غلط عبارت، است از دستار و چاند و کمر بند و پار چہ دیگر عبارت است از سر پہنچ و پائے و کمر بند۔
آئیں و ایسی قسم غلط ہے۔ میر خیر نے سلطنت است۔ (سریلند آندر نام لکھنؤ، سال: تصنیف: ۱۹۵۶ء)

غالب اور ان کے قدردان حسام الدین حیدر خان (مع خاندان کے شعرا)

غالب کے ایک بزرگ اور مہربان دوست نواب میرزا حسام الدین حیدر خان
ناہی فیض آبادی (م ۱۸۳۶ء) لکھنؤ کے رئیس اعظم اور امیر کبیر تھے۔ وہ نواب
شجاع الدولہ بہادر (م ۱۸۵۷ء) کے قرابت داروں میں تھے۔ دلی میں بلی ماراں میں
ایک بڑی اور شان دار خولی میں رہتے تھے۔ یہ محلہ اب تک خولی حسام الدین کے نام
سے مشہور ہے۔^{۱۵۱} غالب بانی کے پڑوسی میں قیام پذیر تھے۔ وہ نواب صاحب کا بے حد
احترام کرتے تھے۔ دونوں میں گہرے اور مربوط تعلقات تھے۔ نواب صاحب ہی کے
ریٹائر غالب نے مذہب اشاعشری قبول کیا تھا^{۱۵۲} کلیات بحر غالب سے معلوم ہوتا ہے
کہ بانی ہی نے غالب کا تعارف شاہان اودھ سے کرایا تھا۔^{۱۵۳}

جب غالب کسی انگریز سے ملنا چاہتے تھے تو بانی ہی ان کی سواری کے لیے
بٹن کا اہتمام کرتے تھے۔ غالب اس کا ذکر ایک خط میں یوں کرتے ہیں:

جناب نواب صاحب، قبلہ و کعبہ دو جہاں مدظلہ العالی۔

آداب کورٹس بجا آوردہ معروض می دارو۔ بندہ امروز آنکب
ملاقات کیے از صاحبان انگریز دارو۔ لیکن آنجا کہ مسکنش حیدر خان

عالم اور ان کے قدروں سام الدین حیدر خان (سج نامی کے حیر)

چھاؤنی قریب محلدار غالت۔ رہے از سطوت آفتاب مہر داو خیل
ہراساں است۔ اگر بخش حمایت گردد در سایہ عطوفت و بکرائے
مدعا می تو اس گردید۔ مگر احساس اینکه وقت ملاقات دوسرے روز
برآمدہ قرار یافتہ است۔ یہ کہاں فرماں رود کہ ہر گاہ آدم نکالنے
باید یہ ہمایے او برآمد۔ اُن وقت اُن جناب در خواب راحت
خواہد بود۔ ۲۵۲

ناتی مرزا غالب کے تخلص مدکاروں میں بھی تھے۔ قرض کے لین دین میں
وہ غالب کے معاون اور وکیل تھے۔ اور انہی کے قرضوں سے اندرجیت اور ہیرا لال
ساہوکاروں سے قرض وصول کرتے تھے۔ ایک خط میں ناتی کو لکھتے ہیں:

اسد اللہ دام پرست شامت و سریشہ توانا کیش بدست شامت۔ حالیہ از اندوہ
تک دینی دلریش درامدہ بکار خویش است۔ دستل کبیرہ و یہ ہزار روپیہ دیکر بکارش
آئیہ سی شامخ خواہد رفت و سودہ خواہد افتاد۔ ۵۲۲

حالی نے ناتی کے حوالے سے ایک روایت بیان کی ہے کہ ناتی مرزا غالب
کے بچپن کے دوستوں میں تھے اور انہوں ہی نے غالب کے لڑکپن کے اشعار الفہم غن
کے بادشاہ میر تقی میر کو اخیر عمر میں دکھائے تھے۔ جب میر نے غالب کے اشعار سنے تو
یہ پیشین گوئی کی:

اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے
رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا، ورنہ بھل بکھے
کے گا۔ ۲۵۳

عالم ناتی کے حسن الخلاق، ہم دردی اور راست گوئی سے اتنا متاثر ہوئے
تھے کہ ان کا ذکر خیر مثنوی ”چراغ دہ“ میں یوں کرتے ہیں:

چو حزن بازوئے ایماں نوہم
حسام مدین حیدر خاں نوہم

عالم کے سر پر بزرگوار نواب الہی بخش خاں معروف (م ۱۸۲۶ء) تائی کے
تخلص دوستوں میں تھے۔ معروف نے اپنے دیوان میں ایک پوری غزل تائی کے نام
نذر کی۔ غزل کا مطلع اور مقطع چس کیے جاتے ہیں:

جو آؤ تم مرے مہماں، حسام الدین حیدر خاں
کروں دل نذر، جاں قرباں، حسام الدین حیدر خاں
دل معروف سے تیری محبت کیوں نہ ہو ظاہر
رہے کیا دل میں بو پنہاں، حسام الدین حیدر خاں

تائی شعر بھی کہتے تھے۔ ان کے دیوان کے دو نسخے ابھی حالت میں محمود آباد
ہاؤس (قیمر بارگ، گلشن) کے تادراں الوجود کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ ایک نسخہ تائی کے
صاحب زادے نواب ذوالفقار الدین حیدر خاں عرف حسین میرزا کے ہاتھ کا لکھا ہوا
ہے۔ اس کی ابتدا میں مرزا عالم کا دیباچہ بھی شامل ہے۔ دیباچے میں عالم نے
تائی کے اخلاق و عادات اور رویشادہ طبیعت پر خاصی روشنی ڈالی ہے۔ عالم کے
دیباچے کے آخری الفاظ یہ ہیں:

کہیں پرش آں فرخ ترخ تابیوں... فرزاد بے ہتا محمد الامرا
صین اللہ صمد الملک سید ذوالفقار الدین حیدر، نکارت خان
بہادر ذوالفقار جنگ الشتر بہ حسین مرزا گرو آوردن آں گھر ہائے
پراگندہ بخت گماشت و عالم پریشاں نوا رہا اٹکاشنی دیباچہ
فرمان داد۔ تا نگارند نامہ را فرمان گرو آورند چاہد بر جان و دل
روائی گرفت بر گنج باد آورد را ز دل نہیں نہرتی چہشہ آمد۔ و بر
در گنجیہ دل کشا پردہ فرو ہشت شد۔ یارب ایں گفتار را در شہرت
روائی و گرو آورند را حنیف ارذانی باد۔

دیوان تائی میں ۲۱۱ غزلوں کے علاوہ مطالع و افریو، منکس، خمس، سلام، حبرا،
ہندکی، حلیم، قصیدہ، رہامیات اور قطعات کے دیگر اصناف بھی موجود ہیں۔ آخر میں

سال تاریخ آں بنا نامی

گفت "نظار خانہ حیدر"
۱ ۲ ۲ ۲

دیوان کے آخر میں نواب میرزا حسین کا ترقیہ اس طرح درج ہے:
دیوان اعجاز بیان جناب والد ماجد نواب مبارک اللہ، ممتاز الملک،
سید حسام الدین حیدر خان بہادر، حسام جنگ، بیار جناب مرحوم،
ایں احقر العباد، سید ذوالفقار الدین حیدر السروف بہ حسین
میرزا۔ از دست خود تحریر نمود و انتہای الی تاریخ نو ذیحہ ماہ
رجب المرجب ۱۲۸۸ ہجری مطابق یکم اکتوبر ۱۸۷۱ء عیسوی روز
پنج شنبہ دوشنبہ شاہ جہاں آباد با تمام رسید۔

ترقیے کے بعد حسین میرزا کی مہر اس طرح چہاں ہے:

۱۲۵۲ ہجری

خان بہادر ذوالفقار جنگ

سید ذوالفقار الدین حیدر جنگ

محمین اللہ ولد مستور الملک

حسام الدین حیدر خان [ؒ] نامی کے حالات زیادہ نہیں مل رہے ہیں۔ ان کی
ولادت فیض آباد میں ہوئی۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نشوونما اور تعلیم و تربیت
بھی وہیں ہوئی۔ فیض آباد سے لکھنؤ اور پھر کچھ مہرے کے بعد لکھنؤ سے فیض آباد گئے۔
وہ اپنے زمانے میں رئیس اہم اور غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔

نامی بادشاہ اکبر شاہ ثانی (م ۱۸۳۷ء) کے عہد سلطنت میں ممتاز حیثیت اور
مصب اعلیٰ پر فائز تھے اور ان کا شمار دہلی کے امرا میں ہوتا تھا ^{۸۵} سرور کہتے ہیں کہ
نامی نواب شجاع اللہ بہادر (م ۱۷۷۷ء) کے قرابت داروں میں تھے۔ جب ان کی
والدہ ماجدہ کا انتقال ہوا تو نامی کے والد نواب سراج اللہ ^{۸۶} نے نواب

قالب اور ان کے قدروں حمام الدین میدان خان (سج خاندان کے شہر)

ذوالفقار اللہ ولد میرزا نجف خان (۱۸۲۴-۱۸۷۸ء) کی بیٹی سے عقد کیا۔ نواب سید محمد خان مدد ان کے بطن سے تھے۔ بانی کو علاقائی والدہ کا سلوک پسند نہ آیا۔ اور وہ لکھنؤ سے نکل کر دہلی چلے آئے۔ یہاں اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا۔ انھوں نے سات گاؤں کی جاگیر کے علاوہ دربار میں عہدہ بھی دیا۔ لکھنؤ سے بھی خاصی رقم ماہوار مل جاتی تھی۔ نقد روپیہ بھی کافی ساتھ لائے تھے۔ دہلی میں چائیداد خریدی۔ شاہان اودھ کی دہلی والی چائیداد کا انتظام بھی انہی کے سپرد تھا۔

بانی کی شادی نواب سیف اللہ ولد بخشی الملک نجف علی خان بہادر مظفر جنگ کی صاحب زادی کے ساتھ ہوئی۔ خوش دامن صاحب کا ۴۸ صدراعشا بیگم (۱۸۰۸ء) تھا۔ دیمائیں بانی کے آخر ان کی تاریخ وفات مندرج ہے۔

بانی اوصاف حمیدہ اور اخلاقی پسندیدہ کے مجھے اور اتحاد و ارتباط کے دلدادہ تھے۔ قاسم ان کے ترجمے میں لکھتے ہیں:

وے جوئے است دمتا، زیبا منظر، نیکو منظر، گفتہ جہیں، طراقت
آگیں، خن سج، بذل کو، نکتہ چرا، کشادہ رو، گرم جوش، خوش مزاج،
نکمر سرور، سر بسر اجتناب، نہایت صاحب شعور و ہوشیار، بظاہر
نیک طبیعت، ذوالشہار^{۱۰۶}

بانی کا انتقال ۳ اکتوبر ۱۸۳۶ء مطابق ۲۲ شوال ۱۲۶۲ھ کو بیمارستان خاں ہوا۔ دہلی میں علی گنج میں درگاہ قدم مبارک کے چوتھے میں دفن ہیں۔^{۱۰۷}

بانی کی اولاد بانی کی تین اولادیں تھیں۔ دو بیٹے مظفر اللہ اور حسین میرزا اور ایک صاحب زادی قدسیہ بیگم عرف حسینی صاحبہ ان کی شادی مرشد آباد کے عالی خاندان امیر محمد نصیر عرف نواب جان سے ہوئی تھی۔ نواب جان زیادہ تر لکھنؤ میں رہتے تھے لیکن قدسیہ بیگم نے زندگی کا بڑا حصہ دہلی میں گزارا۔ نواب جان ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد بنارس کے جرم میں ماخوذ ہوئے تھے۔ ۱۸۵۹ء میں بائیس سے گزرا کر کے لکھنؤ لائے گئے۔ پہلے جس دوام کو سزا ملی، لیکن بعد میں ۱۸۶۰ء میں پچاسی میں

تبدیل ہو گئی۔ یوسف میرزا غمی کے بیٹے تھے جن کا ذکر آگے آئے گا۔ قدسہ حکیم مظفرزادہ سے چھوٹی اور حسین میرزا سے چار سال بڑی تھیں۔

مظفرزادہ ولد: ان کا نام میرزا سیف الدین تھا۔ نواب مظفرزادہ ناصرالملک، خان بہادر سیف جنگ خطاب۔ جناب مالک رام صاحب ^{۱۳۵۶} اور جناب اکبر علی خان مرثی زادہ ^{۱۳۵۶} کہتے ہیں کہ حسین میرزا صاحب ۱۲۲۳ ہجری (مطابق ۱۸۰۸ء) میں پیدا ہوئے اور وہ مظفرزادہ سے ۱۴ سال چھوٹے تھے۔ ان دونوں کے حساب سے مظفرزادہ کی تاریخ ولادت ۱۲۰۹ھ قرار دی جاسکتی ہے۔ حسین میرزا کی تاریخ ولادت معلوم نہ ہو سکی۔ البتہ مالک رام اور مرثی زادہ نے مظفرزادہ کی جو تاریخ پیدائش محققین کی ہے وہ درست نہیں۔ اگر ان دونوں کا مانعہ "حسام الدین حیدر کے خاندانی حالات" ہے، پھر بھی غلط ہے۔ دراصل مظفرزادہ ۱۲۲۰ھ (۱۸۰۵ء) میں پیدا ہوئے۔ دیوانہ ثانی میں تاریخ اس طرح درج ہے:

تاریخ تولد نواب مظفرزادہ ناصرالملک میرزا سیف الدین حیدر

خان بہادر سیف جنگ:

جب خدا نے مجھے دیا تائی

جب یلدائے آرزو کا بدو

کئی تاریخ اس کی تب میں نے

ارشاد و ارجمند و صاحب قدر
ہجری

دوسری تاریخ نثر میں یہ ہے: "ہے عطاء شیر خدا" (۱۲۲۰ ہجری)

مظفرزادہ نے کبھی کوئی مشغولیت قبول نہ کی اور اپنی جائیداد پر امیرانہ گزرواوقات جاری رکھی۔ ^{۱۳۵۶} ان کی شادی شمس قزادہ بخشی الممالک بخشی محمود خان کی صاحبزادی عالیہ حکیم سے ہوئی تھی۔ جب خود ہوا تو مظفرزادہ کو اپنے چھوٹے بھائی حسین میرزا کے حلقہ سخت تشویش ہوئی۔ ہندوستانی سپاہ تمام امور پر قابض ہو چکی تھی۔

حسین میرزا اور خود بادشاہ بے بس تھے۔ جب انگریزی سپاہ دلی میں داخل ہوئی تو مظفر قلعہ دہ دوسرے لوگوں کے ساتھ اللہ چلے گئے جہاں کا راجہ ان کا دوست تھا۔ اللہ میں وہ پکڑے گئے اور کوڑ گاؤں میں انگریز افسروں نے بغیر مقدمے کے انہیں دوسرے لوگوں کے ساتھ گولی مار کر شہید کیا۔

مظفر قلعہ دہ اور ان کے مہمانی عالم کی مسابقتی میں ایک بڑی حویلی میں رہتے تھے۔ حویلی پہلے خدر میں لوٹ لی گئی اور پھر نذر آتش کی گئی۔ عالم کو اس حویلی کے لٹ جانے اور بعد ازاں اسے خاکستر کرنے پر بے حد صدمہ ہوا اور انہوں نے اس دل خراش واقعے پر خون کے آنسو بہا دیے۔ تصنیفات ”دہلیہ“ (۳۱-۳۲) مطبوعہ صد سالہ یادگار عالم کمیٹی میں درج ہیں۔ جب عالم کو مظفر قلعہ دہ کی شہادت کی خبر ملی تو انہیں بے حد قلق ہوا۔ یوسف میرزا کو ایک تحریری خط میں لکھتے ہیں:

اے میری جان! اے میری آنکھیں۔۔۔

تا تائی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ وہ اپنی اہل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم چاہتے تھے کہ وہ اس جہد میں ہوتے اور اپنی آہدہ کھوتے۔ ہاں۔ مظفر قلعہ دہ کا فہم بن تخلص واقعات کر بلائے معلیٰ ہے۔ یہ داغ ماتم جیتے جی نہ مٹے گا۔^{۱۵۱}

مظفر قلعہ دہ کی طرف سے ایک کتاب ”حدائق اٹامشری“ (۱۲۵۵ھ) منسوب ہے۔ اس کا تاریخی نام بھی ہے۔ جس کتاب سے یہ ترجمہ کی گئی اس کا نام ”رسالہ سلیہ“ تھا اور اس کے مصنف سید مہدی علی تھے۔ سید حاتم الدین حیدر خان نے اصل کتاب کا تاریخی نام ”حساب شرع شریف“ (۱۲۳۱ھ) رکھا تھا۔ ”حدائق اٹامشری“ کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن میں موجود ہے۔ ابتدا اس طرح سے ہوئی ہے:

الحمد لله رب العالمین کہ اس نے آب اور آتش اور باد اور خاک

سے آدم بنایا اور بہت پسند آیا تو اسے اشرف المخلوقات فرمایا اور خلعت رسالت کا عطا کیا اور ابوبشر آدم صلی اللہ کا خطاب دیا۔^{۱۲۵}

مظفر قہر کی اولاد کے بارے میں معلوم ہوا کہ ایک لڑکا تھا جس کا نام محمد میرزا تھا۔ غالب نے سجاد میرزا کے نام ایک خط میں ان کا ذکر کیا ہے۔

حسین میرزا: سید ذوالفقار الدین حیدر نام، حمید الامراء معین قہر، مسعود الملک، نکارت خان بہادر ذوالفقار جنگ خطاب، عرف حسین میرزا۔ وہ تائی کے چھوٹے صاحب زاوے تھے۔ ان کی شادی ضمیر قہر جلیل الملک، اختار الامراء احمد حسین نکارت خان بہادر مستقیم جنگ کی صاحب زادی جہاں آرا بیگم عرف حسینی بیگم سے ہوئی۔ خسر کے انتقال کے بعد شادی نکارت کا عہدہ حسین میرزا کو ملا، جس پر وہ غدر تک فائر رہے۔ ان کی عزت و تعظیم کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ بادشاہ کی خواہش میں بیٹھے تھے^{۱۲۶} جب غدر ہوا تو وہ لواحقین کے ساتھ پہلے مسعود جنگ کے مقبرے پر چلے گئے اور کس حالت میں؟ اجیری دروازے سے لے کر مقبرے تک چار پانچ میل کا فاصلہ ہوگا جسے طے کرنے میں دس ہزار روپے کی رقم لٹیڑے گوجروں کے حوالے کرنی پڑی۔ پھر نواب حامد علی خاں، جو نواب احمد قہر قہر (متوفی ۱۱۳۷ھ) وزیر اعظم غازی الدین حیدر بادشاہ کے داماد تھے، حسین میرزا کو مع حلقین چپ چاپ نکال کر اپنے گاؤں برست لے گئے جو پانی پت کے قریب ہے۔ مسعود بادشاہ کے ناخبر رہ چکے تھے۔ ان کی جگہ جگہ تلاش ہوتی رہی۔ جب انگریزوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ برست میں ہیں تو گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے۔ حسین میرزا اس سے پہلے پانی پت پہنچ گئے۔ انصار میں نے جانوں پر کھیل کر انہیں بچایا۔ پھر حسین میرزا بھیس بدل کر کھسٹو پہنچے اور وہاں زد و پیش ہو گئے۔ جب عام صفائی کا اعلان ہوا تو پھر دلی واپس آ گئے۔ یہاں ہانسیاد منبہ ہو چکی تھی۔ اس کے بارے میں مرزا غالب یوسف میرزا کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

کل کے خط کی پشت پر جو سطریں ناظر بی کے ہاتھ لکھی ہوئی

تھیں، اس کے دیکھنے سے آس ٹوٹ گئی۔ کچھ ہاتھ آتا نظر نہیں آتا۔ املاک واقع شہر دہلی کے سوال کا جواب اب کی بار قلم انداز ہوا۔ مکڑ اگر کہا جائے گا تو بے شک یہ جواب آئے گا کہ ہم نے تو عرض اُن مکانات کے یہ مکانات دیے، معاوضہ ہو گیا۔ بھائی، میں پہلے ہی جانتا تھا کہ یہ املاک قتل ہوئی اور وہ سوا لاکھ روپیہ جو عطاؤہ زر مقررہ ملا ہے، وہ دہلی کی املاک کا غلہ بہا ہے۔ پرسوں ناظرین نام کے سرٹاسے میں فرد قہر سب مجموعہ املاک بھیج چکا ہوں۔ خیر یہ وار بھی خالی گیا۔^{۱۸۵۲}

حسین میرزا کے قیام لکھنؤ کے زمانے میں ان کے لکھنؤی عزیزوں کے عطاوہ نواب ضیاء الدین احمد خان قہر نے کمال اہتمام سے حج دوستی اور کیا اور بھتی وہ امداد کر سکتے تھے، دیتے رہے۔ حسین میرزا کچھ عرصے کے لیے بیکانیر میں تحصیل دار ہو گئے تھے۔ جب نواب سالار جنگ اول، وزیر اعظم حیدر آباد (م ۱۸۸۳ء)، دہلی آئے تو حسین میرزا سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ نواب صاحب نے انھیں حیدر آباد آنے کی تاکید کی۔ اچھے میں ان میں جنوں کے آثار نمودار ہوئے۔ جن ہولناک مصائب سے وہ گزر چکے تھے، ان کا نتیجہ بھی ہو سکتا تھا۔ اس پر جہان بیٹے کی اچانک موت نے اور بھی اضافہ کیا چنانچہ باقی ساری زندگی عذاب جنوں گزاری۔ آخر کار ۶ رمضان ۱۳۰۷ھ (مطابق ۶ مئی ۱۸۸۹ء) کو جاں بحق تسلیم ہوئے۔ دہلی میں علی گنج میں مجلس خانے کی چار دیواری کے اندر پہلے دلائل میں دفن ہوئے۔ میرمہدی مجروح کی کبی ہوئی یہ تاریخ قبر پر کندہ ہے:

حسین میرزا چوں مرد در عشق و رضا
ازاں کہ بود ز نسل امیر خیر گیر
ہے شمار سال وقات و رضاں گفت
بیا، بکار چنان اے امیر ابن امیر

حسین میرزا مرزا غالب کے قہایت گہرے دوست اور قاری میں ان کے

شاکر تھے۔ وہ بلا کے سخن فہم اور سخن سنج تھے۔ غالب کی صحبت میں عالمِ عقلی سے حیران سالی تک سیر کی اور مرزا کا فارسی کلام خود ان سے پڑھ کر مرتب کیا۔^{۱۹۵} مرزا انھیں پیار سے ناظر بنی اور ناظر حسین بھی کہتے تھے۔^{۱۹۶}

حسین میرزا نے ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰ء) میں دیوانِ غالب اپنے ہاتھ سے لکھا، پھر اس کے مستند ہونے کے لیے غالب کو پڑھ کر سنایا اور اس پر غالب سے سر تصدیق بھی ثبت کرائی۔ دیوانِ غالب کا یہ نسخہ ”ظاہر ایضاً“ کے نام سے ۱۹۳۶ء میں آغا ظاہر دہلوی نے شائع کیا۔ دیوان کے دوسرے نسخے پر درج ذیل عبارت ہے:

اسی کتاب مستطاب بتاريخ ششم جمادی الثانی ۱۲۷۷ھ (مطابق ہجری دسمبر ۱۸۶۰ء) روز پنج شنبہ در شاہ جہاں آباد از دستِ سید ذوالفقار الدین سعید الموسوی المعروف بہ حسین میرزا علی مدد ابن نواب مبارزۃ ولہ ممتاز الملک میرزا حسام الدین حیدر خان بہادر حسام جنگ مرحوم و مغفور باتمام رسید۔

ہر کہ خواند دعا طبع دارم

زانکہ من بندۂ گنہگارم

لکھنؤ حضرت غالبؒ کا رعبہ را آفرین و گریگان را نوید

غالب

بندۂ علی بن ابی طالب / اسد اللہ خاں غالبؒ ۱۲

حسین میرزا غالب کے مستند اور وفادار دوستوں میں تھے۔ غالب کا اردو کلام انہی کے یہاں جمع ہوتا تھا جو ندر میں لٹ گیا۔ میرزا ایک خط میں مرزا یوسف علی خاں مزہ (م ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء) کو لکھتے ہیں:

بھائی، تم کیا فرماتے ہو۔ جان بوجھ کر ان جان بے جاتے ہو۔

واقعی ندر میں میرا گھر نہیں لٹا مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا

کہ نہ لٹتا۔ ہاں، بھائی غلام الدین خاں صاحب اور ناظر حسین

مرزا صاحب ہندی اور فارسی نظم و نثر کے مضامین مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے سو ان دونوں گروہوں پر جھڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی، نہ اسباب رہا۔ پھر اب میں اپنا کلام کہاں سے لاؤں۔^{۲۱۵}

غالب حسین میرزا سے بھائیوں کا سا سلوک کرتے تھے۔ ایک وقت تھا کہ ان کے والد نواب حسام الدین حیدر خان تاجی قرض کے معاملے میں مرزا غالب کے وکیل تھے۔ اب گروہی زمانہ دیکھیے کہ غدر کے بعد جب حسین مرزا پر وقت آن پڑا اور وہ پراگندہ حال رہے تو غالب قرض کے لین دین میں ان کے وکیل بنے۔ قرض کے بارے میں غالب ۲۹ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو حسین میرزا کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

بھائی، تمہارے خطوں کا اور یسٹ میرزا کے خطوں کا جواب بھیج چکا ہوں۔ اگر کہوں کہ میری جان بھی تمہارے کام آئے تو میں حاضر ہوں، یہ کہاں تکلف محض ہے۔ کون جان دیتا ہے اور کون کسی سے جان مانگتا ہے، مگر جو فکر مجھ کو تمہاری ہے اور جو میری دست دس ہے اس کو میرا خدا اور میرا خداوند جانتا ہے۔ دست دس کو تم بھی جانتے ہو۔ ان شاء اللہ ادا علی ماؤ آئندہ، یعنی نو مہر میں فیہ والا مقصد درست ہو جائے۔

ان سطور کی تحریر سے مراد یہ ہے کہ ابھی بچی لال، تمہارا قرض خواہ، آیا تھا۔ تمہارا حال پوچھتا تھا۔ کچھ بچ، کچھ جھوٹ کہہ کر اس کو راہ پر لایا ہوں۔ کہ سو دو سو روپے تم کو بھیج دے۔ بیوی کی طرح تقریر اس کو بھائی ہے کہ لال، جس درخت کا پھل کھانا منظور ہوتا ہے تو اس کو پانی دیتے ہیں۔ حسین مرزا تمہارے کمیت ہیں۔ پانی دو تو تاج پیدا ہو، بھائی، کچھ تو نرم ہوا ہے۔ تمہارے مکان کا پتا لکھوا کر لے گیا ہے اور یہ کہہ گیا ہے کہ میں اپنے

بیٹے رام جی داس سے صلاح کر کے، جو بات ٹھہرے گی، آپ سے آکر کہوں گا۔ اگر وہ روپیہ ہی بھیج دے تو کیا کہتا ہے اور اگر وہ خط لکھے اور تم اس کا جواب لکھو تو یہ ضرور لکھتا کہ اسد اللہ نے جو تم سے کہا ہے، وہ سچ ہے اور وہ امر ظہور میں آنے والا ہے۔
۲۳۵۱

حسین میرزا نے غالب کے تاہم ایک خط میں اپنی خستہ حالی اور پریشانوں کا ذکر کیا کہ ”میں کہاں جاؤں اور کیا کروں“ اس خط کے لیے نے غالب کو انتہائی متاثر کیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں یوسف میرزا کو ۲۹ نومبر ۱۸۵۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

تمہارے ماموں صاحب کی دستخطی تحریر نے جو میرا حال کیا ہے وہ کس زبان سے ادا کروں۔ ہے ہے، حسین میرزا اور یہ کہے کہ میں کہاں جاؤں اور کیا کروں! اور مجھ کم بخت سے اس کا جواب سرانجام نہ ہو سکے۔ بہت بڑا آسرا تھا اس سرکار کا، خدمت نہ کی، عہدہ نہ سنبھالا، ملاقات نہ کی، سو ڈیڑھ سو روپے درماہ مقرر ہو جانا کیا مشکل تھا۔
۲۳۵۲

مرزا غالب کو جو اخلاص و ارادت حسین میرزا کے ساتھ تھا اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ ایک دن حسین میرزا بیماری سے ڈوب چار ہوئے اور اپنی بیوی سے غالب کو کہلوا دیا کہ ان کے شوہر لکھنؤ میں بہت بیمار ہیں اور وہ پیسے کے محتاج ہیں۔ اس کے جواب میں غالب نے یوسف میرزا کو ایک محبت آمیز خط لکھا:

صبح کے وقت مرزا آغا جانی صاحب آئے اور انھوں نے فرمایا کہ حسین میرزا کی حرم لکھنؤ سے آئی تھی۔ بی عین کے ہاں اتری تھی اب وہ پنڈوی کو اپنے بیٹے کے پاس گئی۔ کبھی تھی کہ نصیب امدا ناظری بہت تیار ہیں۔ خدا خیر کرے۔ یوسف مرزا، میری جان نکل گئی۔ کیا کروں، کیوں کر خبر منگاؤں؟ باقی باقی باقی، دس بارہ

ہار دل میں کہا ہو گا کہ عاری کا بیٹا دوڑا ہوا آیا، اور تین خط لایا، یعنی وہ نیچے حویلی میں تھا۔ ڈاک کے ہرکارے نے خط لا کر دیے۔ نیاز علی اوپر لے آیا۔ ایک خط ہار عزیز کا اور ایک خط ہرگوپال تفت کا اور ایک ذوالفقار اللہ بن حیدر موسوی کا۔ میاں، قریب تھا کہ غشی کے مارے مجھ کو روٹا آجائے۔ ہارے، اس خط کو میں نے آنکھوں سے لگایا۔ تمھیاں لیں۔ آقا صاحب کو سب خط سنا دیا اور ان کو اسی وقت کاشی ناتھ کے پاس بھیجا ہے تاکہ وہ اس کو گربائیں اور شربائیں اور کچھ سجاد مرزا کے واسطے بھجوائیں۔ خدا چاہے تو کچھ سجاد مرزا کو اور کلکتے سے ان کے خط کے آنے کے بعد کچھ ناظرین کو ان سے بھجواؤں۔ میرا وہی حال ہے، بھوکا نہیں ہوں مگر کسی خدمت گزاری کی توفیق نہیں ہے۔ نئے بھلے حال سے گزر رہے جاتی ہے۔ افسوس، ہزار افسوس، جو تم سے اور ناظرین سے میرے دل کا حال ہے، اگر کہوں تو کون باد کرے؟ اور وہ بات خود کہنے کی نہیں، کرنے کی ہے، سو کرنے کا مقدور نہیں۔ ۱۳۵۶

حسین میرزا کی اولاد: حسین میرزا کی تین اولادیں تھیں: سجاد میرزا، اکبر میرزا اور ایک صاحب زادی جو سید افضل حسین کو منسوب تھیں اور انہی کی بیٹی یعنی حسین میرزا کی نواسی ذکیہ بیگم کا نکاح شمس المصطفیٰ مولوی محمد حسین آزاد (۱۹۱۱ء) کے اکلوتے بیٹے آقا محمد ابراہیم سے ہوا تھا۔ اسی سلسلے سے نانی کے خاندان کے قلمی حالات آقا محمد طاہر نصیر آزاد کے پاس لاہور پہنچے تھے۔ یہ کاغذات سید محمد تقی موسوی کیورٹر لاہور میوزیم کی ملکیت میں تھے۔ موصوف نانی کے خاندان کے ایک فرد تھے۔

نواب سید معین الدین حیدر عرف سجاد میرزا: سجاد میرزا شاعر تھے اور سجاد شخص کرتے تھے۔ وہ حسین میرزا کے بڑے صاحب زادے تھے۔ نواب میں مرزا

غالب سے اصلاح لیتے تھے^{۲۵}، لیکن بشیر دہلوی (بحرہء مشفق، غلو، سہ ماہی "اردو"، کراچی، غالب نمبر، مطبوعہ: ۱۹۶۹ء) نے انہیں قربان علی بیگ سالک کا شاگرد لکھا ہے۔ "تذکرہ بشیر" (قلمی) میں یہ بھی درج ہے کہ سجاد میرزا مدرسہ زمانہ واقع نہر سعادت خاں میں مدرس تھے۔

سجاد میرزا ۱۲۹۳ ہجری (مطابق ۱۸۷۶ء) میں صاحب کشف کے ہم راہ تھے تو گھوڑے سے گر کر انتقال کیا۔ مؤلف "مخمس خاتہ جاوید" نے قلمی سے ۱۸۷۷ء لکھا ہے۔ "تذکرہ بشیر" میں ۱۲۹۵ھ سجاد کی تاریخ وفات درج ہے۔ یہ بھی درست نہیں ہے۔ میرزا عبدالغنی ارشد نے ذیل کا مازہ تاریخ کہا ہے:

بینہ کر رنج و غم سے کچھوں آہ

"رنج و غم" کے اعداد ۱۲۹۹ سے "آہ" (۶) کا ترجمہ ہے۔ جس سے ۱۲۹۳ بمآد ہوتے ہیں۔ جناب مالک رام نے "رنج و غم" کے اعداد ۱۳۰۰ اور "آہ" کے ۷ لے لیے ہیں^{۲۶}، جو درست نہیں میرزا جہاں کمال نے یہ تاریخ کہی ہے:

ہے ہے از پیش اسب اللہ

سجاد میرزا بھی علی گنج میں اسی دالان میں دفن ہوئے جہاں ان کے والد کی قبر ہے۔ واصل اسی جہان بیٹے کی ناکہانی موت حسین میرزا کے لیے جاں لیا ثابت ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کی اللہ کے بعد سے وہ بہت پریشاں حال رہے۔ وہی سہی کسر سجاد میرزا کی جہاں مرگی نے پوری کر دی۔

سجاد میرزا نہایت پاکیزہ خیال، جادو مقال شاعر تھے۔ حسن صورت بھی رکھتے تھے۔ حیرانہ بیان دل گداز اور تھکیل کر شر ساز تھی۔ اگر کچھ دنوں اور زعمہ رہتے تو کہنہ مشقی اور چنگی سے قلم زوئے سخن میں اپنے نام کے ڈٹکا بجا دیتے، چند شعر نمونے کے طور پر درج کیے جاتے ہیں:

آئینہ خانے میں ہے محو خود آرائی کا
دام کیا خوب ہے دھولی اسے یکنائی کا

اب تصور میں بھی مجھ کو نظر آتے نہیں تم
ماجرا پوچھتے کیا ہو شب تنہائی کا
یہ جو دیوانہ سا بھرتا ہے یہی ہے سچا
شہر میں شور تھا اس شخص کی دانائی کا

سجاد میرزا سجاد اپنا کلام پہلے مرزا قربان علی بیک سالگ اور میر مہدی حسین
مردح کو دکھایا کرتے تھے۔ جب طبیعت دور بکڑ گئی تو پھر اپنا کلام غالب کو دکھانا
شروع کیا۔ دو شعر ان کے غالب نے بہت پسند کیے تھے، وہ ہم یہاں لکھ دیتے ہیں۔
غالب کی غزل ہے: ”دعا میرے بعد“، ”بغا میرے بعد“، اس پر ایک دفعہ سجاد میرزا
نے طبع آزمائی کی۔ غالب نے اس غزل میں سے چھڑ کر ایک شعر ان کو دیا کہ سجاد
ایسے شعر کہہ کر لاؤ۔ شعر یہ ہے:

جس میں کچھ شکل و شبابت بری ملتی دیکھی

میرے دھوکے میں اسے قتل کیا میرے بعد

ایک دفعہ ایک مشاعرے کی طرح ’کوئے دوست‘ تھی۔ سجاد میرزا نے اس
طرح میں ایک غزل لکھی۔ اس کے ایک شعر پر غالب نے دو صادر فرمائے۔ شعر یہ ہے:

یہ گئی غیر ہے کہ نہیں مجھ کو دھکب غیر

یوں غج دوست ہوں کہ نہیں آرزوئے دوست

ایک بھرے ہوئے مشاعرے میں، جس میں غالب اور ذوق کے
شاگرد موجود تھے، سجاد نے تذکرۃ بالا شعر پڑھا۔ اس پر ہر طرف
سے صدائے تحسین و آفریں بلند ہوئی۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں
قبر کو یہ شبہ ہوا کہ یہ استاد کا حلیہ ہے۔ میرے بھائی نے جس
وقت نواب صاحب کو اصلاح شدہ غزل دکھائی، اُس وقت ان کا
یہ شبہ رفع ہوا اور فرمایا کہ ”میں سجاد تمھاری بساط سے یہ شعر باہر
ہے۔“

غالب سہو میرزا کو بہت چاہتے تھے۔ دونوں میں خط و کتابت بھی تھی۔ ایک خط مؤرخہ ۱۵ مارچ، روز چارشنبہ، ۱۸۶۵ء کو سہو میرزا کے نام لکھتے ہیں:

قرۃ العین سہو میرزا حسین سر اللہ تعالیٰ۔

خوبی دین و دنیا تم کو ارزاں۔ تمہارے خط کے دیکھنے سے آنکھیں روشن ہو گئیں۔ دل کو یمن آگیا۔ چشم بد دور، خط اچھا، عبارت اچھی، اردو میں مطلب تو ایسا اچھے ہو۔ حق تعالیٰ تم کو عمر و دولت عطا کرے۔ اپنے والد ماجد کو سلام کہتا۔ اپنے بھائی مظفر میرزا کو دعا کہتا، اکبر میرزا کو دعا۔ زیادہ، زیادہ۔ نجات کا طالب، غالب۔

نواب اکبر میرزا نواب حسین میرزا ناظمی کے چھوٹے صاحب دلائے تھے۔ میر مہدی مجروح کے شاگرد تھے۔ ان کے انتقال کے بعد انھوں نے ایک جامع مضمون لکھا جو جیشور داس ہاکل دہلی نے اپنے ماہانہ رسالے ”زبان“ دہلی، بابت اپریل ۱۹۰۹ء میں شائع کیا تھا۔ اس کا عنوان ”میر مہدی مجروح“ ہے۔ ”زبان“ کے صفحہ شمارے میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔ اکبر میرزا کا تخلص سید تھا۔ غالب ان کا ترجمہ سب سے پہلے مآتب ”غم خانہ جاوید“ نے لکھا تھا اور وہ یہ ہے:

سنور مجروحان و شاعر شیریں زباں، سید اکبر میرزا، غلبہ صغیر
اللہ نواب ناظم حسین میرزا ابن نواب حرم الدین حیدر خان
ناسی قرابت دار شاہ اودھ۔ آپ نے میر مہدی مجروح سے بھی
استفادہ کیا۔ میرزا قربان علی بیک سالک کے بھی شاگرد رہے۔
مولانا حالی سے بھی نسبت ملحقہ حاصل تھا۔ نہایت معزز اور ممتاز
خاندان کی یادگار تھے۔ برہان الملک میر محمد امین نیشاپوری ان کے
اہل و عیال میں، اور اہل و عیال میں بخشی الملک نواب میرزا نجف
خان بہادر کا نام روشن ہے۔ آپ جس طرح ایک نای گرامی
خاندان کے افراد سے تھے ویسے ہی خلق و اکھار میں احتساب

عاقب اور ان کے قدروں حسام الدین میدغان (سج خاندان کے شعرا)

روزگار تھے۔ آپ کی گفتگو نہایت سلیس و شستہ ہوتی، پاؤں جو بھرانہ
سالی کبھی کبھی خوشی اور بذلہ سخی کی جھلک بھی کلام میں نمایاں ہو
جاتی۔ مشاعروں میں اکثر شریک ہوتے اور اس نقطہ الرجاہ کے
زمانے میں آپ کا دم قیمت تھا۔ آپ کے خاندان میں کئی پشت
سے شاعری کا فن چلا آتا ہے۔ آپ کی سلاست، سادہ بیانی،
خداداد تھی۔ کلام میں تکلف چھو بھی نہ گیا تھا۔ سیدھا سادہ
روزمرہ لکھتے، فصیح محاورات باندھتے۔ جو کچھ کہتے، خوب کہتے۔
ہنگام ترمیم تذکرہ، یعنی قبل ۱۹۲۶ء میں انتقال کیا۔ ۷۰ برس
سے زائد عمر پائی تھی۔ مشائخ، شادان، محقق اور ارحم کے ہم عصر
تھے۔ درد و سوز، جو شاعری کی جان ہیں، کلام میں بدرجہ اتم
موجود ہیں۔

یہاں نمونے کے طور پر چند شعر درج کیے جاتے ہیں:

زمیں تیری، زماں تیرا، نکلیں تیرے، مکاں تیرا
جب باداں ہیں وہ، جن کو نہیں ملتا نکاں تیرا
عیاں ہر شے سے ہے قدرت، نہیں جلوہ کہاں تیرا
ترا مذاج ہے عالم، ٹانخواں ہے جہاں تیرا
حلق سے کہیں بڑھ کر ہے تیرے عشق کا دھج
یہاں تک محو ہوں، اپنے پہ رہتا ہے گماں تیرا
نہ سیرت سے تری واقف نہ صورت آشنا کوئی
تکشا ہے کہ دم بھرتا ہے ہر جہ و جواں تیرا

جہاں شاق تھی دم بھر وہ دن بھی یاد ہیں تھے کو

گھبراں میرا تو رہتا تھا، میں تھا رازدہاں تیرا

یارب، جہاں میں مجھ سا کوئی ہے وہاں نہ ہو

اپنی مصیبت آپ ہی جس سے بچاں نہ ہو

کیا حیرے ہاتھ آئے گا اے برقی شعلہ ریز
نکشن میں اک غریب کا گر آشیاں نہ ہو
میں نے کہا، ستو تو سائیں کچھ حالِ دل
نہیں کر جب ادا سے کہا، داستان نہ ہو
واعظا، حصیں کہہ کہ رہا کیا بہشت میں
گر ہاں قصور و حور و ہے ارقمیں نہ ہو
معمور گر نہ ہو یہ بت و بت پرست سے
ہندوستان کا نام ہی جنت نکلاں نہ ہو

آمد میں جو حرا ہے، وہ آورد میں نہیں

پھر شعر ہی نہیں ہے جو لطف زباں نہ ہو

کوئی چیز یاں دل سے ارزاں نہیں ہے
مگر اس پہ بھی کوئی خواہاں نہیں ہے
دمِ سرد بھر کر کوئی رو رہا ہے
یہ عشقی ہوا اور باراں نہیں ہے
بجز سحر تابان و باو درغشاں
جہانِ حرا غریباں نہیں ہے

بنے بت پرست آ کے ہندوستان میں

کوئی ہم سا سیدھا مسلماں نہیں ہے

اکبر میرزا مجلسیں پڑھتے اور مرے بھی کہتے تھے۔ حالی نے ایک واقعہ یوں

بیان کیا ہے:

مرزا غالب کا ایک فارسی قصیدہ ہے: "ودیا گریستن"، "تجہا
گریستن" کے قافیے میں۔ اس قصیدے کی نسبت سید اکبر میرزا
حکیم امجدی ناظر حسین میرزا مرحوم بیان کرتے ہیں کہ ہندو گاہ

بصرہ میں ایک مجلس عزا تھی اور بارش ہو رہی تھی۔ پانی مجلس نے مجھ سے کہا کہ تم بھی مجھ پر صومہ۔ میرے پاس اس وقت پڑھنے کی کوئی چیز، مرثیہ یا کتاب نہ تھی۔ اسی قصیدے کے چند اشعار دہانی یاد تھے۔ میں نے وہی پڑھ دیے۔ پانچ ہی سات شعروں پر مجلس میں خوب رشت ہوئی۔ عرب، گجی اور ہندی، سب اس مجلس میں شریک تھے۔ مجلس کے بعد ہر ایک گجی مجھ سے پوچھتا تھا کہ اشعار کس شخص کے تھے۔ خصوصاً اس شعر کی بہت تعریف کرتے تھے:

حرو شلاعت و صلاء صبر و غول بہا
 سچ از کسے غواستہ با کریمین^{۲۹۶}

اکبر میرزا کے بڑی نمونے بہت کم ملتے ہیں۔ ”دیوانِ بروج“ پر انھوں نے تقریباً کسی جو دیوان میں موجود ہے۔ دیوان میں یہ تاریخ بھی ہے:

چو دیوانِ بروج گردید طبع
 خوش کردہ آن را درست و صحیح
 خود بے شش و پنج تاریخ طبع
 بکلتا کلام طبع و فصیح

یوسف میرزا: سید ناصر الدین حیدر خاں نام۔ خطاب امتیاز اول عرف یوسف میرزا، مجلس ناصر۔ ناصر کے والد گرامی کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ موصوف، جو بڑے ناز و غم سے یہودان چڑھے تھے، خود کے بعد عرصے تک پریشان حال رہے۔ آخر کار الور میں چلا لی۔ مہاراجا الور کے مزاج میں بہت دشمن ہو گئے تھے، اس لیے خوش و غم رہنے لگے۔ مہاراجا نے پچاس روپے کا ماہانہ تنخواہ بھی مقرر کیا تھا اور اس بات کی کوئی پابندی نہ تھی کہ لازماً الور میں ہی رہیں۔ البتہ یہ شرط بہت ہی ضروری تھی کہ اگر باہر

رہیں تو سال میں دو ایک مرتبہ ضرور یہاں آئیں۔

یوسف میرزا اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ طبیعت میں عراقت تھی۔ یہ لطیفہ مشہور ہے: ان کے ایک چچا کا نام سید محمد رضا تھا۔ ان کے دوستوں میں ایک نواب محمد رضی خاں تھے۔ یوسف میرزائے رضی کی ”سی“ کو پائے تانیٹ قرار دیا اور چوں کہ سید محمد رضا ان کے چچا تھے، اس لیے نواب محمد رضی خاں کو ”چچی“ کہنے لگے۔

میرزا یوسف اور میرزا غالب کے درمیان خانمائی مراسم نہایت مضبوط و مربوط تھے۔ دونوں میں عرصے تک خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ خود کے بعد یوسف میرزا کھنڈ چلے گئے۔ دہلی میں ان کا بھرا گھر لٹ گیا اور قیامت ٹوٹ پڑی جس کا مختصر حال خطوط غالب میں موجود ہے۔ پہلے بڑے ماموں نواب مظفر اللہ دہلوی موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ اس کے بعد بیٹے کا داغ کھاتا پڑا۔ پھر دہلی گرامی (نواب جان) کو انگریزوں نے گولی سے اڑا دیا۔ یہ ایسے دل خراش اور روح فرسا حادثات تھے کہ غالب کا دل بھی خون کے آنسو رو رہا تھا۔ ایک خط میں یوسف میرزا کو لکھتے ہیں:

یوسف میرزا، کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا اور اگر لکھوں
تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو، مگر صبر؟ یہ ایک شیوہ فرسودہ
ابتلائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور بھی کہا
کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہاں، ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ
اسے کہتے ہیں کہ ٹو نہ ترپ۔ بھلا کیوں کر نہ ترپے گا۔ صلاح اس
امر میں نہیں بتائی جاتی، دعا کو دخل نہیں، دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا
مرا، پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کس کو
کہتے ہیں، تو میں کہوں گا، یوسف میرزا کو۔^{۳۵۵}

ایک اور خط میں حسین میرزا کی لاچاری اور بے بسی کے بارے میں

لکھتے ہیں:

کل قصدا خط آیا۔ بھائی حسین خاں کیوں ہوئی؟ حسین میرزا

صاحب کیوں پیار ہوئے؟ خدایا ان آوارگانِ وحشتِ غربت کو
 ہمیت، جب تو چاہے حمایت کر، مگر مصدقِ مرتضیٰ علی کا، مکتوب
 رکھ۔ اللہ فلہ! حسین میرزا کی ڈاڑھی سفید ہو گئی۔ یہ شدتِ غم و رنج
 کی خوبیاں ہیں۔ اس عہد کے بچپن ہی اپنی اور ان کی خیر و عافیت
 لکھتے۔ ۳۳۵

قہر کے بعد یوسف میرزا کو مفلسی نے ایسا پریشان اور مجبور کیا کہ روزگار کے
 لیے پاؤں پیلے پڑے۔ وہ خانقاہی رئیس اور صاحبِ جاگداد تھے۔ جو کچھ بھی تھا وہ سب
 لٹ گیا۔ اب مالی پریشانیوں نے ایسا طحال کر دیا تھا کہ انھوں نے غالب سے مدد کی
 درخواست کی۔ غالب نے اسی دنوں واحد علی شاہ سلطانِ عالم کی تعریف میں ایک قصیدہ
 لکھتے اس امید پر بھیجا تھا کہ جو کچھ بھی وہاں سے ملے گا اس میں سے نصف
 یوسف میرزا اور ان کے ماموں حسین میرزا کو دوں گا اور نصف رقم اپنے مصروف میں
 لے آؤں گا۔ چنانچہ دوم جمادی الاول ۱۲۷۶ھ (۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء) کو یوسف میرزا
 کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

یہ خط اپنے ماموں صاحب کو پڑھا دینا اور فردا ان سے لے کر
 پڑھ لینا اور جس طرح ان کی رائے میں آئے، اس پر حصول
 مطلب کی پتا اٹھا لینا اور عداوت کا جواب شتاب لکھنا۔
 ضیاء الدین خاں رہنما چلے گئے، اور وہ کام نہ کر گئے۔ دیکھیے، آ
 کر کیا کہتے ہیں، یا رات کو آگئے ہوں، یا شام تک آجائیں۔
 کیاں کروں؟ کس کے دل میں اپنا دل ڈالوں؟ بہ مرتضیٰ علی پہلے
 سے نیت میں یہ ہے کہ جو شاہِ اودھ سے ہاتھ آئے حقیر برادرانہ
 کردوں۔ نصف حسین میرزا اور تم اور سجادہ نصف میں مفلسوں کا
 حار۔ ۳۳۵

یوسف میرزا شعر بھی کہتے تھے اور ناسرگھس کرتے تھے۔ جناب مالک رام

یوسف میرزا ہی کے نام لکھے ہوں گے۔ ان میں ایک علاحدہ خط کسی مولوی وحید الدین کے نام بھی شامل ہے۔ چنانچہ یہ خطوط دلچسپی سے خالی نہیں اور ان میں طرافت کی چاشنی بھی ہے، اس لیے مزید تحقیق کے لیے چند کتابسات درج کیے جاتے ہیں:

(۱) کون سنتا ہے فغان درویش

قہر درویش، بہ جان درویش

میرے پیر و مرشد جناب مولوی وحید الدین صاحب کو میری تسلیم! حضرت، آپ نے اپنے خادم کو ایسا بھلایا کہ خط کیسا خالی سلام بھی کسی کی زبانی نہ آیا۔ خیر دل سے نہ بھلائیے گا۔ شکایات کا موقع زبانی ہے، باقی کہانی ہے۔ حضور، اب قصور معاف کیجیے۔ آپ ہی آئیے اور اس شہر کو بھی لے آئے دیجیے۔ واللہ ہم آپ کے کمال و تصرف کو ماننے ہیں۔ اگرچہ کشش محبت ہی چیز ہے، یہ سب جانتے ہیں۔ آپ کا کس کو انکار ہے۔ یہ تو چشم نہائی بے کار ہے۔

(۲) کہیں کیا، مجھ سے کسی کا ہے اہارا دل پر

تو نے مقرر مری جاں، کھینچ کے مارا دل پر

ہے ہے، اب کی محرم میں دو طرح کا غم ہے۔ ایک تو شہر میں عزاداری میں ہی کم ہے، دوسرے اور بھی تخفیف ہوئی یہ بڑا الم ہے۔ اس خط کے مضمون ماتم... نے اچھا کام کیا۔ تم نے عترۂ محرم کو... سلام کیا۔ میں تو غم امام بہر طور ممکن ہے، لیکن یہ بات کہاں۔ وہ نوست، جن سے رقت بدرجہا تھی، کا ہے کو سٹائی دیں گے۔ خالی ماتم کریں گے۔ مختصر کلام، خط آپ کا آیا۔ مجھ کو آپ نے رح اسباب قزوے داری بلایا تھا۔ سنیے، وہاں کا ماتم دیکھنے کا میں شائق ہوں، مگر حسب الطلب ضرور چلا آتا۔ ہاں،

فقط اتنا پس و پیش ہے کہ یہاں کی خبر گیری اور نگرانی میں کسی قدر ضرورت کم و بیش ہے۔ اس سے بہتر یہ تھا کہ کسی مستجر کو بھیجتے جو لے جائے اور اگر دور ہو تو بندہ اپنا ہرج کرے۔ جیسا لکھیے، اب ویسا کیا جائے۔

(۳) ۱۱۱۱ میں دو تین سے متحیر تھا کہ یہ باعث کیا ہے جو خود بخود طبیعت کچھ بتا رہا ہے۔ ذہنی آنکھ ہر بار پھڑک جاتی ہے۔ عشرہ بحر ظم امام میں روئے۔ اب بے اختیار ہنسی چلی آتی تھی۔ اس کا سبب سنئے۔ کبکس نہ کیجئے۔ اپنی چہ میگوئیاں رہنے دیجئے۔ مبارک ہو، مبارک۔ ڈاکیا اکبر آباد کا دروازے پر حاضر ہے۔ سرنامہ چڑھ کے ایسے ہوئے جس کے بیان میں زبان قاصر ہے۔ وہ کیا کہ میرے دوست...

(۳) بچکی سی آج کیوں دم فریاد آگئی

یادش بخیر، کس کو مری یاد آگئی

آج تو کسی بھاکوان کا منہ دیکھا تھا۔ لکھیے، بندہ نواز، اپنے عاشق بھراں نصیب کی تسلیم قبول کیجئے۔ آپ کے لوازش نامے کا فقرہ کو کیا مہری رہائی ہے۔ باقی کہانی ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، کہیں یہ فقرہ محمول یہ خوشامد ہو جائے۔ میں نے اپنی مذمت المعر میں ایسا شخص دیکھا نہ سنا۔ انصاف کرے تو ذرا مشکل ہے۔ سہل المستع اسی کا نام ہے۔ ان شاء اللہ، چشم بدو، میرے نزدیک تو اگر مرزا رجب علی بیک ^{۳۳۵۶} زندہ ہوتے تو اپنے لکھے کو بہت دنوں روئے۔ وہاں رے فقروں کی صفائی۔ اللہ رے عمارت آرائی۔ قلم توڑ دیا ہے، کارنامہ کیا ہے، اب یہ بحث تو فضول ہے، اس سے کیا حاصل ہے؟ ذرا میرے پیارے دوست میںاں قیر ^{۳۳۵۷} کو

بلوائے۔ حضرت سلامت، میدان میں آئیے۔ زمین آسمان کے
قلا بے نہ ملائیے۔ آپ نے تو بڑی چمک دکھ سے میری شکایت
کو نکالا تھا۔ اچھا بہانہ بھارے مولوی کا نکالا تھا۔^{۳۶۵}

حواشی اور حوالے

- ۱۵۰ "لم خات ہادیہ"، جلد چہارم، ص ۳۱۱۔ حربہ تصنیفات کے لیے "دیوانی تائی" مرثیہ ڈاکٹر اکبر حیدری (مطبوعہ ۱۹۷۲ء) ملاحظہ ہو۔
- ۱۵۱ "ذکر قالب"، ناگ رام، ص ۳۸۔ دیوانی قالب، نسخ مرثی، پہلا ایڈیشن، ص ۳۱۷
- ۱۵۲ "دیوانی تائی"
- ۱۵۳ "تکلیبات سحر"، مطبوعہ مطبعی نوکلور کھنڈ، ۱۳۸۳ء، ص ۱۱۱
- ۱۵۴ ایضاً
- ۱۵۵ "یارگار قالب"، ص ۹۸
- ۱۵۶ "سورۂ تنجیز"، نواب اعظم اللہ دار میر محمد خاں سرور، مرثیہ خواجہ احمد فاروقی، ص ۷۷
- ۱۵۷ خطوط، "تکلیبات سحر" کے خاتمہ، کتبچہ ۱۳۶۱ء
- ۱۵۸ نواب سراج اللہ، نام میرزا فیاض الدین محمد خان، خطاب نواب سراج اللہ دار خان بہادر نصرت جنگ۔ قادی میں شعر کہتے تھے اور قیامت گھنٹیں کرتے تھے۔ حربہ تصنیفات کے لیے "دیوانی تائی" (ص ۲۹-۳۰) دیکھا جاسکتا ہے۔
- ۱۵۹ "مجموعہ نقوش"، حصہ دوم، بحیثیت قدرت اللہ کام، ص ۲۵۹
- ۱۶۰ "مجموعہ شعرائے ہند"، مولوی کریم الدین، مطبوعہ ۱۸۳۸ء، ص ۲۲
- ۱۶۱ "مطالعہ قالب"، ناگ رام، پہلا ایڈیشن، ص ۱۳۹
- ۱۶۲ مکتوب نام رام
- ۱۶۳ "قصر الخوارق"، جلد دوم، سید کمال الدین حیدر، ص ۲۵
- ۱۶۴ "امداد کے مکتوب"، مطبعہ تجزیاتی، دہلی، ۱۸۹۹ء، ص ۲۲۵
- ۱۶۵ "قصر الخوارق"، جلد دوم، مطبوعہ نوکلور پریس، کھنڈ، ۱۸۹۹ء، ص ۲۵۸
- ۱۶۶ "امداد کے مکتوب"، حصہ اول، ص ۲۶۵
- ۱۶۷ "لم خات ہادیہ"، ص ۳۱۱
- ۱۶۸ "امداد کے مکتوب"، ص ۲۵۸

۲۱۵	ایضاً، ص ۱۵۶
۲۲۵	ایضاً، ص ۲۳۵
۲۳۵	ایضاً، ص ۲۶۲
۲۴۵	ایضاً، صفحہ ۵۸-۵۹
۲۵۵	"نغم حاکم چاندی"، جلد چہارم، ص ۸۷-۸۸
۲۶۵	"مکتبہ قائب"، ص ۱۳۶
۲۷۵	"دریچانہ نائی"، ص ۵۳
۲۸۵	"نقشہ"، قائب نمبر، ص ۲۲۸
۲۹۵	"نغم حاکم چاندی"، ص ۱۱۰-۱۱۱
۳۰۵	"یادگار قائب"، ص ۵۵
۳۱۵	"مکتبہ نے مکتبہ"، ص ۲۵۶
۳۲۵	ایضاً، ص ۲۵۶
۳۳۵	ایضاً، ص ۲۶۲

۳۴۵ "قباۃ القایب" کے مصنف مرزا واجب علی بیگ سرور۔ ان کا انتقال مرزا قائب سے ایک سال قبل ۱۲۸۲ء میں ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصل اس کے بعد لکھا گیا ہے۔

۳۵۵ قائب شہاد الدین احمد خان: اردو میں داستان اور قاری علی غیر لکھی گئی تھیں۔ قائب کے قرابت دہوں اور شاگردوں میں تھے۔ ان کا انتقال ۳ رمضان ۱۳۰۲ ہجری مطابق ۲۷ جون ۱۸۸۵ء کو دہلی میں ہوا۔ حضرت غلام غلام الدین علیا، کاکائی داغ سرولی میں دفن ہوئے۔ گورنر نے عود کار داغ لکھی:

ہم دہلی کو بخون تھا ابھی پاؤں سے
کہ نظر آئے تھے ہر فن کے یہاں اہل کمال
صل شعر کے تھے صدور لعلوں میں بھی
قائب سحر بیاں، شیعہ نغمہ نغمہ حال
مولوی عطوی و سہیل و ذوق و سوجن
ان میں ہر ایک ختم نغمہ تھا بے مثل و مثال
تھوڑے ہی عرصے میں وہاں کدہ دنیا سے
راہی ملک عدم ہو گئے یہ ایک نصال
ان میں سے ایک یہ تھے حضرت آخر باقی
آہ ان کے بھی لے آ گیا بزم زوال
ہاں بزم اہل ہو گئے سرسب تن
اب نہ وہ بزم، نہ وہ ساتھی غمخیز حال

نائب سردار کے قہر دہان تمام الدین چہر دہان (سچا خاویں کے صبر)

مے کد ہو گیا سناں۔ پڑے ہیں ہر سو
ٹوٹے پھرتے کہیں سائر تو کہیں جام سناں
اب وہ ہاتھی نہ رہی سناں صبر دہان
نور جارج کہا، "غرب ہے ہاتھ کا سناں"
("دعوائی مکرورج"، مطبوعہ ۱۸۶۹ء، ص ۴۳)

نوٹ: بعض خطوط میں تاریکیوں بھی درج ہیں۔ اس خط پر ۳۰ دسمبر ۱۸۶۸ء کی تاریخ لکھا ہے۔



غالب، سالار جنگ اور ذکا

نواب سالار جنگ بلند عظمت و منزلت کے مالک تھے۔ حیدرآباد دکن میں ان کے رجبے کے مقابل اور کوئی خطاب نہیں ٹھہرتا۔ ان کا نام نامی میر تراب علی خان، خطاب شمس الامراء، مختار الملک، نواب سالار جنگ تھا۔ انھوں نے سالار جنگ اول کی حیثیت سے اپنی لیاقت، حسن تدبیر، خیر خواہی و دلچسپی برطانیہ و حکومت نظام کی بنیاد پر جو شہرت حاصل کی تھی وہ نہ صرف دکن بلکہ ہندوستانی مسلمانوں میں سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ ان کا سلسلہ نسب اسیس قرنی تک پہنچتا ہے اور ان کے بڑا بھائی باقر مستوفی الملک شہنشاہ دہلی کی طرف سے کشمیر کے نائب تھے۔ ان کے فرزند محمد تقی شاہان اورنگ زیب، بہادر شاہ و فرخ سیر کے عہد میں دربار کے معزز اراکین میں سے تھے، جن کی وفات ۱۱۳۵ھ (۱۷۲۱ء) میں ہوئی۔ ان کے صاحب زادے صدر خاں فیروز جنگ افشانی الملک خانی خاں بہادر نے، جو دیوانی صوبہ دار دکن تھے، ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۰ء) میں انتقال کیا۔ ان کے بیٹے علی زمان خاں فیروز جنگ، مشیر الدولہ مشیر الملک دیوان ہوئے۔ ان کے فرزند ارجمند میر محمد علی خاں مشیر الملک امیر الامراء تھے۔ ان کی شادی ۱۸۰۳ء میں دکن کے امیر کبیر میر ابو القاسم میر عالم دارالہمام کی دوسری

صاحب زاوی کے ساتھ ہوئی۔ حیدرآباد میں میرعالم کی یادگاریں اب تک قائم ہیں جن میں میرعالم کی منڈی (ایک بڑا بازار) اور شہر سے کچھ فاصلے پر ایک پختہ تالاب، جو فن تعمیرات کا عجوبہ ہے، مشہور ہیں۔ میرتراب علی سالار جنگ میرعالم کے نواسے تھے۔ سالار جنگ کی ولادت ۲۲ فروری ۱۸۲۹ء کو ہوئی۔ ان کی تربیت و پرورش میں ان کے دادا ضیر الملک امیر الامرا کا خاصا ہاتھ تھا۔ میرعالم کے بعد مسجد وزارت پر وہی جلوہ افروز ہوئے تھے۔ ضیر الملک کا انتقال ۲۷ مئی ۱۸۵۳ء کو ہوا تو نواب ناصر الدولہ فرماں روا سے دکن نے سالار جنگ کو کم سنی کے باوجود قلم دان وزارت سپرد کیا۔ موصوف بلند ہمت تھے، ان کی طبیعت میں عزم و استقلال کا مادہ تھا۔ انھوں نے اولوالعزمی کے ساتھ تمام ملکی تھیوب و فراز پر قابو پالیا۔ اسی زمانے میں تختہ نادر نمودار ہوا۔ اس پڑا شوب دیکھنے میں انھوں نے نہ صرف حیدرآباد کو قضاو سے محفوظ رکھا بلکہ ہندوستان میں بھی انگریزوں کی امداد سے دریغ نہ کیا۔ قوی دلی ہمدردی میں وہ کسی سے کم نہ تھے۔ سرسید کے مشن کو ان کی ذات سے جو تقویت پہنچی اور علی گڑھ کالج نے ان کی بدولت جو فائدہ اٹھایا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

نواب سالار جنگ نے حیدرآباد کو علوم و فنون کی روشنی سے سحر کیا تھا۔ انھوں نے حیدر اسکول کھولے اور ہندوستان سے قابل اور لائق لوگوں کی خدمات حاصل کیں۔ ان میں نواب عماد الملک سید حسین بکھراوی وغیرہ ہیں۔ ۱۸۷۶ء میں لندن کے سفر میں نواب موصوف بھی ان کے ہمراہ تھے۔ سالار جنگ نے قیام انگلستان کے زمانے میں بیش بہا قیمتی کتابیں اور قرآن مجید کے حیدر نسخے اور دوسری نادر و نایاب چیزیں خریدیں۔ انگلستان کی واپسی کے بعد وہ روم بھی گئے۔ وہاں کے بادشاہ سے ملاقات کی۔ روم میں وہ نادرالوجود ہنسنہ ویلڈ رییکا (Veild Rebecca) خریدا جو آج بھی سالار جنگ میوزیم میں موجود ہے اور سیاحوں کا مرکز توجہ بنا ہوا ہے۔ یہ میوزیم نوادرات اور قیمتی مخطوطات کا ایک بیش قیمت خزانہ ہے۔

نواب سالار جنگ جب مارچ ۱۸۷۰ء میں لکھنؤ آئے تو ان کی آمد پر ملٹی

نولکھور نے ”اودھ اخبار“ کا ایک خصوصی شمارہ جیسے کے طور پر بعنوان ”پرچہ ضروری“ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۸۷۰ء، وقت صبح“ جاری کیا۔ یہ چار صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کی تفصیلات ”اودھ اخبار“ نمبر ۱۱، مطبوعہ ۱۸ مارچ ۱۸۷۰ء، مطابق ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۸۶ھ، روز شنبہ، جلد ۱۲ کے ساتھ شامل ہیں۔ قریل میں قصیدہ اخبار سے چند باتیں درج کی جاتی ہیں:

عالی جناب شوکت مآب نواب مختار الملک سید تراب علی خاں سالار جنگ کے درو لکھو کے بارے میں ایک بسیط مضمون درج ہے۔ جن لوگوں نے ان کا استقبال کیا تھا ان میں حکومت کی طرف سے سرکردہ اعلیٰ افسروں کے علاوہ معززین شہر بن بھی تھے۔ ان میں خصوصیت سے راجا امیر حسن خاں امیرالدولہ اور فشی نولکھور صاحب مالک مطبع ”اودھ اخبار“ و ”لکھو پائرس“ شامل تھے۔ راجا صاحب نے دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ تنظیمین میں نولکھور صاحب بھی مخصوص کیے گئے تھے۔ ۲۲ مارچ ۱۸۷۰ء کے پرچہ (ص ۲۹۵) میں درج ہے کہ نواب سالار جنگ لکھو میں معشوق منزل میں اترے تھے۔ جن لوگوں نے ان سے ۱۸ مارچ کو ملاقات کی تھی ان میں فشی صاحب کے ساتھ ”اودھ اخبار“ کے ایڈیٹر رفیق علی بھی تھے۔ صفحہ ۲۹۶ میں چمپا ہے کہ جب سالار جنگ کان پور کے لیے سوار ہوئے تھے تو جن لوگوں نے آئینہ پر انھیں رخصت کیا تھا ان میں افسران کے علاوہ راجا امیر حسن خاں اور فشی نولکھور صاحب بھی موجود تھے۔ فشی صاحب کان پور تک ان کے ہمراہ تھے معشوق منزل لکھو میں نواب موصوف کی ملاقاتیں فشی صاحب کے ساتھ بے تکلفانہ رہی تھیں۔ نواب صاحب نے مطبع ”اودھ اخبار“ کے بارے میں ایک

حیات کا اظہار کیا تھا۔

جب ماہِ ربیع الاول ۱۳۰۰ ہجری (۱۸۸۳ء) میں ڈیمک آف میٹروپولیٹن اور حیدرآباد ہوئے اور نواب سالار جنگ نے ان کی دعوت کا اہتمام رات کو تالابِ میرحالم پر کیا تو اسی روز نواب موصوف کی طبیعت خراب ہو گئی اور بیٹے میں جلا ہو کر ۲۹ ربیع الاول ۱۳۰۰ء (مطابق ۸ فروری ۱۸۸۳ء) کو روزِ پنج شنبہ ساڑھے سات بجے رات انتقال کیا اور بروز جمعہ وہیں پہنچے دن کو دائرۂ میرسون حیدرآباد میں دفن کیے گئے۔

نواب سالار جنگ علم دوست، ادب نواز اور سخن شناس تھے۔ اہلِ کمال کے قدردان اور مہربان تھے۔ یہ مرزا غالب کی انتہائی بد قسمتی تھی کہ بار بار عرض و امیں بھیجے کے باوجود وہ نواب موصوف کے لطف و کرم سے محروم رہ گئے۔ نواب صاحب نے حیدرآباد میں ایک بڑا دفتر ”دارالافتاء“ کے نام سے قائم کیا تھا جہاں بڑے بڑے اہلِ کمال ملازم تھے۔ اسی دفتر میں محمد حبیب اللہ شخص و کا خصوصی کاتب کی حیثیت سے ۱۸۵۶ء میں ملازم ہوئے تھے۔

و کا کا خاندان واصل بھاپور کا رہنے والا تھا۔ ان کے والد بزرگوار حافظ محمد میزبان ناٹکی تھے۔ و کا ۱۲۳۲ ہجری (۱۸۱۸ء) میں نلیور میں پیدا ہوئے۔ جناب مالک رام صاحب نے ”سلاطینِ عالم“ طبع دہلی، ص ۱۸۲ میں و کا کا سال ولادت و کا کی تصنیف ”خاش و غاش“ کے دیباچے کے حوالے سے ”بے خود مدعوئے“ سے نکالا ہے۔ ماڈل تاریخ میں غلام سہو کاتب لکھا ہے۔ میرے خیال میں صحیح ماڈل تاریخ ”بے خود بخودی“ ہے۔ اس سے ۱۲۳۳ء کے اعداد نکلتے ہیں۔ و کا ۱۲۷۲ء (۱۸۵۰ء) میں ۳۸ برس کی عمر میں حیدرآباد آئے اور یہاں سید محمد عباس (والد نواب مہدی نواز جنگ) اور عبدالوہاب حسینیؒ کے قوتل سے نواب مختار الملک سالار جنگ کی سرکار تک پہنچے اور دارالافتاء میں نواب صاحب موصوف کے خصوصی کاتب مقرر ہو گئے۔ پہلے وہ حیدرآباد میں میرٹھ الدین فیض (سنہ ۱۲۸۳ء) سے اصلاح لیتے تھے اور ۱۸۶۲ء میں جب

غالب کی استادی کا شہرہ سنا تو ان سے اصلاح لینے لگے۔ کہتے ہیں:

فائل ہوں میں غالب کے ڈکا طرزِ سخن کا

ایسا کوئی دلی میں سنخور نہ ہوا تھا

ڈکا بدلتوں تک نواب سلاور جنگ کے میرٹھی رہنے کے بعد تعلق دار درجہ سوم

مقرر ہوئے، لیکن نواب صاحب نے ان کا حیدرآباد سے کہیں جانا گوارا نہیں کیا۔ ڈکا

کبھی دلی نہ گئے اور غالب حیدرآباد نہیں آئے۔ دونوں میں ایسا عاقلانہ اور روحانی رشتہ

تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ دونوں میں کئی سال تک

خط و کتابت جاری رہی۔ غالب ڈکا کا خاطر خواہ احرام کرتے تھے اور ڈکا کو ”میر اور

ایمانی“ اور ”دوستِ روحانی“ کے اعزاز سے محترم کرتے تھے۔ جب ۱۲۸۵ھ میں غالب

کا انتقال ہوا تو ڈکا نے ذیل کی تاریخ لکھی:

میرا استاد معنوی غالب

جس کا ہر لفظ معنی اجاز

وعدہ لا شریک نہ کی قسم

ایک فنِ سخن میں بے انباز

ایسی قسمت کہاں جو میں کرتا

پردہ چشم صرف پا انداز

ہاں سنا ہے کہ اس کے تھے کردار

جیسے گفتار حافظ شیراز

کیا جب ہے جو حرمِ بے سے

بخش بھی دے کریم نکتہ نواز

بند کا انورسی و سحری تھا

سخن اس پہ ہیں سخن پرداز

خود ہی فرما کیا ہے یہ مطلق
پیش بینی کا دیکھنا اعجاز
”اسد اللہ خاں تمام ہوا
وا ورینا، وہ رجب شاہ باز“
پہلے مصرع سے تا پہ آخر شعر
سال تاریخ کا ہے جلوہ طراز
غیب دانی صفت خدا کی ہے
اک حد کی کمی میں تھا یہ راز

غالب کے مصرع اول سے ۱۲۷۵ھ کے اعداد نکلتے ہیں۔ دوسرے مصرع
کے ”باز“ کے ۱۰ ہجرت جمع کر کے ۱۲۸۵ھ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ دوسری صورت یہ
ہو سکتی ہے کہ غالب کے مصرع ثانی کے ”شاہ“ کے لفظ سے ”باز“ کے ۹ ہجرت نکلتے ہیں۔
تاریخ یوں گچ نکلتی ہے ۱۲۷۵ھ + ۹ = ۱۲۸۴ھ۔ ”ایک جس کی کمی کی طرف آخری مصرع
میں اشارہ کیا گیا ہے اس کے مطابق تاریخ یوں نکلتی ہے۔ ۱۲۸۵ھ = ۱ + ۱۲۸۴
ہجری۔“

ذکا کا انتقال ۴۷ سال کی عمر میں ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۵ء) میں حیدرآباد میں ہوا۔
جناب مالک رام صاحب نے ”مات فی عشق رب حبیب اللہ“ ماوۃ تاریخ لکھا۔ یہ
ماوۃ تاریخ نواب حفیظ الدین خاں پاس کا طبع زاوہ ہے۔

غالب نے ۱۸۶۴ء میں خط کے ذریعے سے ذکا سے نواب سالار جنگ کی تحن
پروردی، قدردانی اور مزاج کی کیفیت کے بارے میں دریافت کیا۔ ذکا نے مطلع کیا
نواب صاحب، صاحب ذوق اور تحن شناس ہیں اس لیے ان کے نام کتابیں روانہ کی جا
سکتی ہیں۔ غالب نے امداد کے لیے جو خطوط سالار جنگ کو بھیجے تھے ان میں سے دو
تین خط کلیات نثر میں ملتے ہیں۔ اس وقت میرے سامنے کلیات نثر کا وہ نسخہ موجود

ہے جو ۱۸۶۷ء میں غشی نولکھور صاحب نے لکھنؤ میں شائع کیا تھا۔ صفحہ ۱۹۲ میں خط کا آغاز رہائی سے ہوتا ہے:

والا نظر اسرار گمراہی گمراہ
کز فہمیں تو یافت روتی ایں کہہ سرا
یارب چہ کسے لفظ شمس الامرا
جزویت تر اجزائے رقم نام ترا

اس کے بعد اپنی شاعری اردو قاری کے بارے میں لکھتے ہیں:
شعر و سخن را ہانہا و کترین بچہ روحانی است و خامہ از بدو فطرت
در گہر افشانی در آغاز ریختہ گفتنی و بہ اردو زبان سراے بودی تا بہ
پاری زبان ذوق سخن یافت۔ ازاں وادی عیان اندیشہ برتافت۔
دیوان مختصرے از ریختہ فراہم آورد۔ آں را طبعہ طاق نسیاں
کرد۔ کما بیش سی سال است پاری سال است۔

پھر غالب خط میں قصیدے کا ذکر کرتے ہیں:
چہ قصیدہ از سید کہ غم دہاں آتش افروخت۔ غم سوخت آپے و از
خرمنے کہ برق آں را پاک سوخت، دود امدہ گیا ہے فرخا بخت
عریفہ نگار کہ بہ تسمایہ چشم داشت، قبول داشت۔ روزے چند
بشاردانی نہد و دریں تنہائی داد ہمدی خویش۔

اے منظر کل در ازل آثار کرم را
منت سر لوح ز اسم تو قلم را
شمس الامرا کز شرف نسبت نامش
خود قبلہ بر اورنگ تہیان مجم را

جب غالب نے دیکھا کہ بھیجی گئی تصانیف کے بارے میں نواب
سالار جنگ کی طرف سے کوئی رسید نہیں آتی ہے تو انہوں نے

دیوانی رشتہ کے بارے میں ایک اور خط ۱۱ ربیع الاول ۱۲۷۸ھ (ستمبر ۱۸۶۱ء) کو روانہ کیا، لکھتے ہیں:

در نام گزشتہ کہ بقضائے عمر فزائے سال اگست پیشانی و صغرا از
پس ہی گزشتہ منتخب دیوانی رشتہ کہ تازہ بکلیہ اطمینان فرو
رشتہ اند در مومنین جامہ نہادہ بنظر گاہ روشن گزر گاہ حضرت ملک
رفعت آسمان سلیمان منزلت فرستادم۔ چوں درود ساری صحیفہ بر اثر
ارسال پارسل اتفاق افتاد۔ در اندیشہ ہی سلیم کہ مگر اس نگارش
حسب انکسائے پیشگاہ وزارت بودہ است و بمیان نیامدن سخن از
رسیدن سفینہ اردو و خواہش مجموعہ نظم قاری در گیرندہ بدیں اشارت
بودہ است کہ بکار نیاید پیش کش آں باید۔ دیگران خواہم کہ
رسیدن و نارسیدن دیوانی اردو باز دائم و نیز بدائم کہ طلب کلیات
قاری چنان کہ گماں بودہ ام ہزار ہا حضرت معنی القاب است۔ یا
ہمیں از جانب صحیفہ طراز را در ہر دو صورت فرماں پذیر ہی آئین
خواہم بود۔

کلیات نثر (صفحہ ۲۳) میں ایک خط ملتا ہے جو غالب نے نواب سالار جنگ
کی تعریف میں لکھا تھا اور جس کی رسید کے لیے وہ کرمند اور مضطرب تھے:
قصیدہ مدحیہ فرستادہ ہاشم و عنایت ہاشم کہ مطبوع طبع اقدس افتاد یا
ش۔ ایں خود تھے بود کہ در سراپسنگی بزدان رفت۔ بنور ایں نیز عنایت
ام کہ بنظر گاہ خدا نگاہ گزشتہ یا خود عرصہ در عرض تک گفت۔

غالب نے نواب سالار جنگ کو اکسٹہ اشعار پر مشتمل اپنا قصیدہ بڑے اہتمام
کے ساتھ بھیجا تھا۔ یہ قصیدہ میں نے نہایت اچھی حالت میں سالار جنگ میوزیم کے
شعبہ خطوطات میں خوب صورت فریم میں دیکھا اور میں نے اس کا فوٹو بھی حاصل کیا

جو کتاب میں مضمون کے ساتھ شامل کیا جاتا ہے۔ قصیدے کے چند شعر یہ ہیں:

در مدح خن چہاں نہ گویم
 شرط ست کہ داستان نہ گویم
 از زہد و درخ خن نہ نام
 از سبھ و طلیہاں نہ گویم
 عیار الملک را دریں عصر
 جز آصہ جم نکاں نہ گویم
 کوئی کہ بہ چشکاو خواب
 بسیار گویے، ہاں نہ گویم
 پاکیزگی نہاد پاش
 جز در صہ قدسیاں نہ گویم
 در مرتبہ کاخ دولتش را
 زہی ششدرہ شادساں نہ گویم
 نازم روش خن سراسے
 از گوہر خود نکاں نہ گویم
 روشن دل و آستین زباہم
 از دودہ و دودماں نہ گویم
 در لقمہ بلند پایہ راندم
 دلا سے خانماں نہ گویم
 دلا کہو، سپہر جاہا
 میرم اگر آں چہاں نہ گویم
 سامان چشم نیم کہ خود را
 جز مویہ مویہاں نہ گویم

عالمِ سار دکن نہ دامن
از تاز و سارہاں نہ گویم
ایں نیست نماز جنگاں
کس جہ نہاں ازاں نہ گویم
کافر ہاشم اگر شایع
بیستہ نہاں نہاں نہ گویم
شیام اگر دعائے دولت
از ہم قصاں نہاں نہ گویم
آہں شوم کر از سرشاں
با مردم ایں جہاں نہ گویم

قصیدے کی ابتدا میں غالب کی یہ بڑی عبارت بھی موجود ہے جو پہلی مرتبہ
سامنے آ رہی ہے:

یارب در حضرت ملک رفعت دانش خدو خداوان خدا جوئی و دان
داور حق شای حق کوئی۔ بہرام رزم، پردیج رزم جناب دہلیوں
الحاق نواب مختار الملک بہادر، دام اقبال، عذر تھا رواں دانش
چکاسہ و پنجشنبہ نیاہنامہ مقبول و آمرو فراتی صحیفہ طراز شکیبہ
آگہی از رسیدن محیفہ راز منظور باو۔

قصیدے کے مطلوبہ اور قلمی فنون میں الفاظ و ترتیب میں کچھ اختلاف بھی
ہے جو درج کیا جاتا ہے:

کوئی کہ ہر پیش گاہِ خواب
بیدار گویے، ہاں نہ گویم

مطبوعہ:

مصرع اول میں ”کوئی“ کی بجائے ”کھٹے“ ہے۔

تلمی:

از ویدہ دری و پایہ دانی
ہمایہ فرقدان نہ گویم

مطبوعہ:

در ویدہ دری و پایہ دانی
ہمایہ فرقدان نہ گویم

تلمی:

والا گہرا پہر چاہا
میرم اگر آچٹاں نہ گویم
مطبوعہ کلیات میں اس شعر کے بدلے یہ دو شعر ہیں:

والا گہرا پہر چاہا
ایں ہا ز رہ گماں نہ گویم
تک ست دل از بھوم اعدہ
میرم اگر آچٹاں نہ گویم

تلمی:

ایہ من ایں ترانہ ہا ما
شورامہ ہاستاں نہ گویم

مطبوعہ:

ایں زمزمہ ہاے خوشچکاں ما
شورامہ ہاستاں نہ گویم

قلمی:

آہم کہ اگر ز آہام
پرسند ز ریمساں نہ گویم

مطبوعہ:

ایں یکہ اگر ز آہام
پرسند ز ریمساں نہ گویم
ذیل کا شعر قلمی نسخے (سالار جنگ) میں نہیں ہے:
کارم پہ عزم و صفر پار
شہرید و مہرگاں نہ گویم

قصیدے میں ردائی، سادگی، روایف و توانی اور مدح گسٹری کے علاوہ قاری الفاظ کے استعمال میں وہ ساری باتیں طویل خاطر رکھی گئی تھیں جن کا ڈکا نے مشورہ دیا تھا۔ قصیدہ اگرچہ طویل ہے لیکن اس قدر غلغلہ اور سلیس ہے کہ ممدوح ایک ہی نشست میں پڑھ سکتا تھا۔ یہ نومبر ۱۸۶۱ء میں نظم کیا گیا تھا اور اسی مہینے میں نواب سالار جنگ کو ارسال کیا گیا تھا۔ ممدوح کو قصیدہ نومبر کے اواخر یا ۲ دسمبر ۱۸۶۱ء سے قبل مل گیا تھا اور یاد کیا جاسکتا ہے کہ نواب میر نظام حسین خاں صفدر جنگ حسام الدولہ نذر الملک، خیر معظم نواب صاحب موصوف کے انتقال ۳ دسمبر ۱۸۶۱ء سے پہلے موصول ہوا تھا۔ نواب سالار جنگ کی نظر سے قصیدہ گزرنے کی اطلاع ڈکا اپنے خط میں غالب کو اس طرح دیتے ہیں:

قصیدہ مدیحہ وصول ہوا۔ ممدوح نے اس کے اوراق دیکھے۔ دیکھتا یہ کہ اس کے دیکھنے سے کیا نکلتا ہے۔ اب جب کہ حالات بدلے، نذر الملک کی رحلت سے جگر خون ہو گیا۔ یہ بلند پایہ جاہ مند وہ ہے کہ جس کی صاحب زاویٰ جناب وزارت کی بیوی ہیں۔ اب مذمت عزا گزرنے تک میں کہاں، اور میں جو کرتا چاہتا ہوں

وہ کہاں! خط کا جواب دینا ضروری تھا اور آج جناب والا کے صحیفہ دل نواز نے مزید تاکید کا کام کیا۔ ان امور پر مشتمل ایک خط لکھنا ضرور ہے جو پہلے عرض کیے گئے ہیں کہ اس زمانے میں ”سمیا کہا“ اور ”کس نے کہا“ دونوں کا اظہار ضروری ہے۔

ڈکا نے مذکورہ بالا خط کی آخری سطور میں مرزا غالب کو یاد دہانی کی تھی کہ وہ مختار الملک سالار جنگ صاحب کو عرض داشت بھی روانہ کریں جس میں اپنا تعارف کرا دیں۔ غالب نے ۱۰ مارچ ۱۸۶۲ء کو ڈکا کے کہنے کے مطابق نواب صاحب موصوف کو ایک عرض داشت بھیجی۔ اس کی ایک نقل ڈکا کو بھی ارسال کی۔ عرض داشت سالار جنگ کو موصول ہوئی اور ان کی نظر سے گزری۔ اس سلسلے میں ڈکا نے صورت حال دریافت کرنے کے لیے مزید جنگ و دو کی تھی۔ اس کی اطلاع غالب کو بھی روانہ کی۔ خط کے چند جملے یہ ہیں۔

نواب مختار الملک کے نام ۱۰ مارچ کو لکھی ہوئی عرض داشت نہایت درست و مناسب ہے اور اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا میری خاطر خطا اندیش میں کھٹکا تھا۔ یہ عرض داشت معروض الیہ کی نظر سے گزری۔ میں نے دفتر کے ہر شفی مولوی سید عبدالقادر کو اس پر آمادہ کر لیا ہے کہ وہ دوبارہ ذکر پھیریں اور جناب والا کے عائد کو پھر سے گوش گزار کریں، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ گزارش دل نہیں ہو گئی اور عبارت شیریں نے خمیر کو جس طرح کام بخشی پر رجوع کیا ہے، وہ صاف جھٹکا پڑتا تھا۔ جواب فرمایا جو مصلحت آمیز تھا۔ فائدہ اس کا یہ ہے کہ خط ضرور ہے اور واسطے بھی۔ اس جواب سے کہ جو مصلحت وقت کے لحاظ سے سخن سازوں کا منہ بند کرتا ہے، یہ کہتا ہے کہ ”زبان آدھ ہندوستان“ کو پشیمودہ طور پر تعارف نہیں چاہیے۔ اس کے بعد اگر

عرض داشت اور قصیدے کا شئی ایجنٹ دہلی یا کسی انگریز کے قوتند سے سمجھیں جو وہاں ذی اقتدار ہو۔ حضرت نے اپنے قلم سے جو فقرہ لکھا تھا، ممکن نہیں کہ اس کا بطلان ہو سکے۔ (فقرہ، بروخان نوال نواب مختار الملک بہادر بخشی و بہرہ و بہرمن نیز نہادہ اندہ) ”خاش و خماش“، ص ۱۱۳

قصیدے کے بعد ذکا کے مشورے پر ۱۰ مارچ ۱۸۶۲ء کو غالب نے نواب سالار جنگ کو جو عرض داشت بھیجی تھی، وہ کہیں دستیاب نہ ہو سکی۔

قیام حیدرآباد کے زمانے میں غالب کا ایک خط ذکا کے نام میری نظر سے گزرا ہے۔ اس کا نمبر ۵۷۹۸ ہے۔ اس کے ساتھ حیدرآباد کی معروف شخصیت نواب سرآساں جاہ کے چشم و چراغ نواب عنایت جنگ کا ایک خط بھی ہے جس پر ۳۸۹۳۹ نمبر درج ہے۔ غالب کا یہ خط اصل میں نواب عنایت جنگ کے پاس موجود تھا جو بعد میں انھوں نے کتب خانہ آصفیہ کی نذر کیا تھا۔ نواب موصوف صاحب ذوق تھے۔ ان کے پاس کچھ فلمی کتابیں بھی تھیں جن میں دیوان میر کا قدیم نسخہ مکتوبہ ۱۱۹۲ ہجری بھی تھا جو بعد میں انھوں نے ڈاکٹر عی الدین قادری زور کو دیا تھا اور جو آپ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے۔ نواب عنایت جنگ صاحب نے غالب کا خط اپنے خط کے ساتھ جناب ڈاکٹر رحمت اللہ صاحب کیورٹر کو ۲۲ اپریل ۱۹۵۵ء کو بھیجا تھا۔ اس کے ساتھ ذیل کا نوٹ بھی تھا، جس پر ۶۰ رجب ۱۳۳۲ھ کی تاریخ موجود ہے:

غالب دہلوی کا خط: یہ خط حبیب اللہ ذکا بالکلی کے نام ہے۔ خلیع نیلور مدراس کے رہنے والے حافظ محمد میران (مدان) کے فرد ہے۔ ۱۳۷۲ھ میں حیدرآباد میں آپ کو مختار الملک نے مٹھی گری پر تقرر کیا۔ بعد میں دوم تعلق دار ہوئے۔ ۱۳۹۲ھ (۱۳۹۱ء) میں انتقال کیا۔ ان کی تصانیف سے ”خاش و خماش“ میرے ہاں موجود ہے۔ مفضل حالات ”تاریخ ناطہ“ مولانا عزیز جنگ میں ہیں۔ سنا ہے، اچھے ادیب اور بہتر شاعر تھے۔ مرزا مہدی خاں

کوکب سے اکثر ذکر آتا رہا۔ شاید کوکب کو علم تھا۔ ۱۲۲۲ھ میں جونیہ مرزا محمد تقی خاں تقی جو کب خانہ آصفیہ سے تعلق رکھتے تھے اور سید علی شہسزری کے شاگردوں میں تھے۔ چند کتابیں میں نے خریدی تھیں۔ من جملہ ان کے ایک دیوان صائب تھا جو خطبہ صائب حاشیہ پر۔ بعض جگہ صائب نے کچھ اضافہ اور کمی کی ہے جس کو میں نے پروفیسر مرزا حسین علی کو تحفہ ان کے ذوق کا لحاظ کرتے دے دیا۔ آخری حصہ ندامت ہے۔ اس خط میں جس قصیدے کا ذکر کیا گیا ہے، گمان ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ سرکار کی شان میں ہے۔ دارالانشا کا ذکر ہے۔ دارالانشا کا تعلق ذات شای سے تھا۔ کہیں سے مطلوبہ نسخے میں ہوتا پتا چلے گا۔ میرے دلیہ مرحوم کے لئے والوں میں سے تھے۔ اکثر یہ ضمنی تذکرہ میر انہیں ان کا بھی ذکر فرمایا کرتے تھے۔

غالب نے مذکورہ بالا خط سے پہلے ذکا کو ۱۰ ربیع الاول ۱۲۶۹ھ (مطابق ۲۶ اگست ۱۸۶۳ء) کو ایک خط لکھا تھا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ نواب سالار جنگ نے میری طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی۔ خط کے ضروری جملے یہ ہیں:

میں برس دن سے بیمار اور تین مہینے سے صاحب فراش ہوں۔ اٹھنے بیٹھنے کی طاقت مفقود، پھوڑوں سے بدن لالہ زار، پوست سے پٹیاں نمودار۔ پھوڑے ایسے جیسے انگارے سنگتے ہیں۔ اعضا پر دس جگہ بھائے لگتے ہیں۔ ضعف و ناتوانی علاوہ، سوز غم ہاے نہانی علاوہ۔ مصیبت سہل مشق میں میں نے نواب عظامالک کو قصیدہ بھیجا، کچھ قدردانی نہ فرمائی۔ ایک کم سٹر برس کی عمر میری ہوئی۔ سوائے شہرت خشک کے فن کا کچھ پھل نہ پایا۔ "احسن و مرہا" کا شوق سامعہ فرسا ہوا۔ خیر سائنس کا حق سائنس سے ادا ہوا۔ عظامالک نے یہ بھی نہ کیا۔ نہ مدح کی داد دی، نہ مدح کا

صلہ دیا۔ حیران ہوں کہ نواب صاحب مجھے کیا کہے۔

عالم ۲۵ ستمبر ۱۸۶۳ء کے خط میں ذکا کو لکھتے ہیں:

ناچار اب آپ سے یہ چاہتا ہوں کہ آپ مولوی صاحب سے ملیں اور ان کو یہ خط اپنے نام کا دکھائیں اور میری طرف سے بعد سلام میری کلیات کے پارسل کا ان کے پاس اور ان کے ذریعہ عنایت سے اس جلد کا حضرت ننگ رافعت نواب مختار الملک بہادر کی نظر سے گزرتا اور جو کچھ اس کے گزرنے کے بعد واقع ہو، دریافت کر کے مجھ کو مطلع فرمائیں۔

آخر میں عالم کا وہ خط درج کیا جاتا ہے جو انھوں نے ذکا کے نام ۱۶ جمادی الثانی ۱۲۸۰ھ^{۳۵} مطابق ۲۸ نومبر ۱۸۶۳ء کو لکھا اور جو نواب عنایت جنگ کے پاس محفوظ تھا۔ اس خط میں عالم نے قصیدے، عرض داشت اور پارسل کا ذکر کیا تھا۔ جس میں دیوان عالم (اردو) اور کلیات عالم (دعویٰ) رجسٹرڈ ڈاک سے بھیجا تھا۔ پارسل کے بعد مرزا نے یاد دہانی کے طور پر مسلسل نو عرض داشتیں نواب سالار جنگ کو بھیجی تھیں۔ نواب صاحب کی طرف سے نہ تو عالم کو کتابوں کی اور نہ ہی کسی خط کی رسید ملی تھی۔ دیوان رشتہ کا جو نسخہ بھیجا تھا وہ عالم مطبع احمدی اموجان دہلی کا تھا جو ۲۰ صفر ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) کو چھپا تھا۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ خط کی عبارت ملاحظہ ہو:

بندہ پردہا پرسوں مولوی صاحب کا خط آیا تھا، مکتب فیہ بہ سخیل نقل ہے۔۔۔ آج مسودہ عرض داشت کا جو آپ نے مجھ کو بھیجا تھا، چنگا و آگے نامدار گزارتا اور اپنے جام کے خط کا بھی پیش کرنا مناسب جاتا۔ بعد ملاحظہ کے یوں ارشاد ہوا کہ قصیدہ اور عرض داشت کی تحقیق اور تلاش کی جاوے جو دارالانشا میں ملے تو جواب لکھا جاوے۔ یقین ہے کہ بعد گرد آہنی کاغذات کے اگر

عرضداشت مل گئی یا قصیدہ نکل گیا تو جواب ملے گا۔ اب میں
بقول صاحب:

در ماعداء کار غموم حیرانی الطوار خودم

ہر لحد دارد تھمتی چوں قرعہ رمال با

یوں سمجھا ہوا تھا کہ نو لٹانے جو علی التواتر یکے بعد دیگرے ارسال ہوئے
ہیں، متواتر دارالافتا میں پہنچے ہوں گے اور میرٹھی نے حضور میں گزارے ہوں گے۔ اب
ثابت ہوا کہ دفتر پہنچے بھی تو مرجع کی نظر سے نہیں گزرے بلکہ بعید نہیں جو فتی نے
چاک کر کے پھینک دیے ہوں۔ مانا کہ یوں ہی ہوا۔ بشرط التفات مولانا میرا مطلب
اس صورت میں بھی فوت نہیں ہوتا، یعنی مولوی صاحب کہہ سکتے ہیں کہ یہ جو تذکرہ اس
کی میری معرفت گزری ہے اس کے قبول ہونے کی عجز اطلاع میں وہی کچھ لکھا جائے
جو قصیدہ و عرض داشت کے گزرنے کے بعد لکھا جاتا۔ مولوی مؤید الدین خاں صاحب
جو حضرت کے مقرب اور اس حضرت میں میرے مقرب ہیں، یہ کلے مؤخر کہہ سکتے ہیں،
مگر میں ان سے نہیں کہہ سکتا کہ آپ یوں کہیے۔ خیر جو ہوتا ہے ہو رہے گا۔ تم کو یہ
اطلاع دے کر اطلاع کرتا ہوں کہ آیا وہ دونوں کاغذ دفتر سے نکل کر پیش ہوئے یا
نہیں ۱۲۔

آگے اس سے جس دن دیوان کا پارسل اور خط مولانا کو بھیجا ہے اس کے
دوسرے دن ایک پارسل اور ایک خط آپ کو میں نے بھیجا ہے۔ آج تک اس پارسل کی
رسید میں نے نہیں پائی۔ سخت محوش ہوں۔ اگر وہ پارسل پہنچ گیا ہے تو اس کی رسید
بھیجے۔ اگر نہیں پہنچا تو وہاں کے ڈاک گھر میں دریافت کیجیے اور میرے خط کا جواب
جلد لکھیے۔
نجات کا طالب، نائب

ہاں، خوب یاد آیا، وہ قصیدہ بھی اس کلیات میں مطبوع ہو گیا ہے۔ صفحہ ۳۳۶
سطر ۱۲۔ دفتر سے قصیدے کا کاغذ نہ نکلنے کی صورت میں بھی قصیدہ ممدوح کی نظر سے گزر
سکتا ہے۔

والسلام مع الاکرام

حاشیہ

- ۱۵۱ "رقبات دہر" حیدرآباد دکن میں سید عبدالوہاب عسکری نواب سلاار بنگ اقبال کے دارورہ تھے۔ ان کے اور مرزا دہر کے درمیان خط و کتابت بھی پائی تھی۔ موصوف شاعر تھے اور مرثیہ بھی کہتے تھے۔ مرثیہ گوئی میں وہ دہر کے شاگرد تھے۔ کتب خانہ آسٹریہ حیدرآباد میں فن اکتا کے تحت ایک خطوط خط فکست میں ہے۔ اس پر "رقبات دہر" لکھا ہوا ہے۔ اصل میں خطوط میں فن خطوط کی نقل رکھی گئی ہے جو عسکری صاحب نے مرزا دہر اور مرزا امیر کو لکھے تھے۔ سید عبدالوہاب سلاار بنگ کے دارالافتاء کے دارورہ تھے۔
- ۱۵۲ قائب نے ڈاکا کے نام خط کی ابتدا میں، جیسا کہ گس خط سے معلوم ہوتا ہے، تاریخ جوں لکھی تھی: "جمعہ شب ۱۶ جمادی الثانی سال ۱۱۰۲ھ"۔
- "مظفر" سے ۱۲۸۰ ہجری کے احوال ملتے ہیں۔ یعنی خط ۱۶ جمادی الثانی ۱۲۸۰ھ کو لکھا گیا تھا۔

مضمون کی تیاری میں درج ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا:

- ☆ "ادکار دربار" حصہ دوم (۱۹۸۱ء) مرتبہ دین محمد، مطبوعہ یادگار آفیس، لاہور۔
- ☆ "ادیب" (الآباد، پبلیشنگ آکٹوبر ۱۹۹۳ء) (ص ۸۱۶-۱۷۶) مضمون نگار: سید محمد صادق
- ☆ "سوانح عسکری نواب سلاار بنگ مرحوم" مرتبہ مولوی سید امجد علی اشعری، ۱۹۰۶ء، الخیمہ پریس، لاہور
- ☆ "نجات کجا جناب مولانا محمد کج الزمان" مرتبہ مفتی محمد مظفر حسین خاں سلیمانی، مطبوعہ ۱۹۸۱ء، مطبعہ دولکھورہ لکھنؤ
- ☆ "نکاح حیدرآباد" از دکن راج سکین، حیدرآباد
- ☆ "محبب الرحمن" مولوی عبدالجبار ملکپوری
- ☆ "مستطیعہ آسٹریہ" (جلد دوم) مرتبہ محمد مہدی، کراچی، پاکستان
- ☆ "پیشانی عسکریہ" مؤلفہ میر دلہا علی دہلوی، ۱۹۳۳ء
- ☆ "ڈاکا اور قائب" فیض الدین احمد گلپ، حیدرآباد
- ☆ "مطالعہ قائب" طبعی قائب، ۱۹۸۴ء، پبلیشنگ ہاؤس، رام
- ☆ "مطوبہ قائب" مرتبہ نظام رسول خیر
- ☆ "کلیات سحر" (قائب)، مطبعہ لوگھنوا، ۱۹۶۷ء



- ☆☆ یہاں "آک حیدر کی" سے مراد مسرہ اولی کے احوال (۱۹۷۵ء) میں "۶۰" کی جگہ ہے جو "۱۰۰" شہر "یعنی لکھنؤ" سے پوری ہو جاتی ہے۔ (دارورہ)



مرزا غالب اور مفتی میر محمد عباسؒ

مرزا غالب خاندانی اجتہاد و لکھنؤ کے علما کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان کی علمی استعداد کے قائل تھے۔ ان میں سے جن بزرگانِ دین کے ساتھ ان کے تعلقات و مراسم مربوط و استوار تھے ان میں خاندانِ غفران مآب کے چشم و چراغ سلطان العلماء سید محمد قبلہ، سید حسین سید العلماء، سید تقی صاحب ممتاز العلماء وغیرہم قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ مرزا صاحب میر محمد عباس قبلہ مفتی صاحب کے بڑے معتقد اور مداحوں میں تھے۔ مفتی صاحب عالم، جید اور فاضلِ یکاۓ تھے۔ دینی معاملات میں مرزا صاحب ان سے استفادہ کرتے تھے۔

مفتی صاحب کے جید اعلیٰ سید نعمت اللہ جڑاڑی تھے۔ ان کی ولادت ۱۰۵۰ھ (۱۶۳۹ء) اور وفات ۱۱۱۲ھ (۱۷۰۰ء) میں ہوئی تھی۔ سید موصوف مقتداے عالم اور مجاہدے اراکین تھے۔ تقریباً ایک سو کتابیں مہسوط، علوم معقول و منقول میں ان کی تالیفات و تصانیف ہی ہیں۔ یہ کتابیں عراق و ہجرت کے مجتہدین میں مروج ہیں۔ ان کا سلسلہ نسب ۷۱ پشتوں سے امام موئی کا تہم تک مٹھی ہوتا ہے۔

مفتی صاحب کے بیٹے احمد سید محمد جعفر، محمد نواب آصف الدولہ بہادر میں ۱۲۱۰ء (۱۸۹۵ء) میں شوشتر سے وارد لکھنؤ ہوئے تھے۔ ان کے بارے میں ”تختہ العالم“ (سال تصنیف ۱۲۱۶ھ) میں مذکور ہے کہ:

ذوالنور الازہر السید محمد جعفر بن السید طالب سلمہ اللہ از عباد و
پارسایان روزگار و در حسن خلق و ہمت قفری نادرۃ اعداء و بکسر
خواہی عباد از اعلیٰ و ادنیٰ معروف و وجہ ہمتش بانجام مطلب
سائین مصروف و در آداب مجلس و رکنی سستی سلیقہ اش بکمال
رسائی و در جود و ایثار دانی بجز افسانہ حاتم طائی است۔ فیاض
محتاج، شگفتہ باوکرامت کردہ است کہ باوجود بے ایشاعتی ہرگز
سائل را محروم نداشتہ است۔ در پندہبہ حال تحصیل مقدمات را در
شوشتر نمودہ و در فارس و عراق بہ تحصیل طب و نجوم پرداخت و در
ہر دو بکمال رسید۔ از آنجا بہ ہندوستان افتادہ بناکاری بسر برد۔ حقیر
او را پاں نواح تحدیدہ یوم۔ مراسیم و شاعر بود کہ او برآمد، بالکلہ
کہ رسیدم از وفور اشتقاق برادرانہ از لکھنؤ پانچا رسید۔ و ہاں
سعادت مستفیض گردانید۔ حالیا ہم درآں بلدہ روزگارے بہرت
وارد۔ بہ طبابت مشہور و بغایت درویش و آزادہ است۔ توفیق عود
بوطن نہ گشت۔

سید محمد جعفر نے باقیات صالحات میں دو اولادیں چھوڑیں۔ سید علی اکبر
(والدہ مفتی صاحب) اور سید عباس۔ سید علی اکبر نے شوشتری خاندانی رسم کے مطابق
اپنے بیٹے مفتی صاحب کا نام چچا کے نام پر حمزہ سید عباس رکھا تھا۔ سید علی اکبر فارسی
زبان پر قدرت رکھتے تھے۔ اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے
اور آہنی گھس کرتے تھے۔

سید علی اکبر کا انتقال ۱۰ رجب ۱۲۶۱ھ (اگست ۱۸۴۵ء) میں ہوا مفتی

صاحب نے مثنوی ”ذریعہ شہادہ“ میں ان کے مختصر حالات نظم کیے ہیں۔ ان تاریخ وقات کے قتلے میں لکھتے ہیں:

حضرت سید علی اکبر لقب آنکھ بڑے نیک نام اعدا اتمام
حیرت کائنات و ثابت در سخن غیرت جہان و دامن در کلام
با لباس کہن و با تان خشک تر زباں از فکر حق بڑے عام
بزلہ سچ و خندہ رو با ہمدماں گرم آہ و گریہ در بزم امام
رفت و از خار و خسب دنیا کشید دامن، و شد راہی دارالقام
خامہ تاریخ و قاتل ذو رقم
شد مقیم گلشن دارالسلام

مفتی میر سید محمد عباس وہ شبہ آخر ربیع الاول ۱۲۴۳ھ (اپریل ۱۸۰۹ء) کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ”غورید کمال و ادب“ تاریخ ولادت ہے۔

مفتی صاحب نے ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد سات برس کی عمر میں مولوی عبدالقدوس صاحب (شاگرد ملا حسن صاحب) سے ”شرح سلم“ سے ”مصابیح“ شروع کی۔ اس کے بعد مولوی قدس اللہ صاحب (شاگرد بحر العلوم مولوی عبدالعلی) سے کتب معقولات و حساب و فلسفہ و ہیئت و ہندسہ پڑھ کر چودہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے اور کتب نبی کا سلسلہ شروع کیا۔ دیگر علما کے علاوہ مفتی صاحب نے سید اعلیٰ آقا سید حسین، مولوی قدس اللہ علی اور سید الدولہ مرزا حسن علی خاں سے بھی استفادہ کیا تھا۔

مفتی صاحب کا انتقال ۲۵ ربیع ۱۳۰۶ھ (مارچ ۱۸۸۹ء) کو لکھنؤ میں ہوا۔

مولانا سید ابوالاد حسین صاحب ستیم نے ذیل کا قطعہ کہا:

در لحد خوابیدہ چوں مفتی ما خاک حسرت بر دل و لہجہ فزونی قناد
از زمیں برخاست شور و تپش نالہ با در سبکدوش خطرا قناد
سوز غم دل ہر اہل دل آتش اعدا عالم جانہا قناد

چوں ببارید انکب غوں در تاب شب باصرہ از دیدہ قنار قنار
 خاک پاکش کے جدا گشت از جہاں گونیا عرش خدا از جا قنار
 نیست لطف ناخدا کز شایخ دہر عدلیہ کلین زہرا قنار
 اے سلیم ارکان سائنس را مگر

آہ قصر اجتہاد از پا قنار

مفتی صاحب امام بارگاہِ غفروں مآب میں دفن کیے گئے۔

مفتی صاحب بادشاہ احمد علی شاہ کے عہد میں نگرہ وزارت کے مفتی قرار دے دیے گئے تھے اور واجد علی شاہ کے زمانہ سلطنت (۱۸۳۷ء تا فروری ۱۸۵۶ء) تک بدستور یہ عہدہ ان کے حلقہ رہا۔ بادشاہ کو مفتی صاحب سے بے حد عقیدت تھی۔ علی الخصوص مفتی صاحب کے اشعار و منظومات سے خاص دل بٹگی تھی۔ موصوف نے اپنی کتاب مثنوی ”محسن چمن“ کا ایک نسخہ بادشاہ کو بھیجا۔ بادشاہ نے اس کی رسید میں ۱۸۹ اشعار نظم کر کے بھیجے، چند شعر یہ ہیں:

سلطان اودھ تراب اقدام	واجد علی جس کا رکھا ہے نام
چرخ دوم بھی مینا	اس سن میں ملا جب خزینا
جب ”محسن چمن“ کتاب پائی	فی الغور وہ پھولوں میں بسائی
سبحان اللہ، دھک دیا	یہ نظم ہے یا کہ مجرہ تھا
ہر بیت پہ بیج حق کا دھکا	منظوم نہ تھے، رہن ملک تھا
اس محسن چمن کے آگے ہے خار	نظام خزاں تو درد نثار
اور دھک دھک و حیرتی و متعلیٰ	صائب زہ سے فزوں ہوئے ہیں بیدل
اور محکم اس سے ہے حشم ہے	جو مدح کروں بہت ہی کم ہے
افزودنی کو ہے ملا بیاباں	خاکانی گمگاہے شہر کہیاں
افزوں کہیں تیر سے ہے سید	ہے پائے جلال امیر از حد

خیر سند رہیں جناب مہاش

نے نگرہ نہ نظم ہو اور نہ دواں

ملتی صاحب نے ظلم سلطانی کے جواب میں ایک عرض داشت نثر و نظم میں اور ایک قصیدہ بھی نظم کیا تھا۔ ان کے اور بادشاہ کے درمیان مکاتبت بھی تھی اور آپس میں اپنی تصانیف ایک دوسرے کو بھیجتے تھے۔ واجد علی شاہ کا انتقال ۱۳ محرم ۱۲۰۵ھ (ستمبر ۱۸۸۸ء) کو ہوا۔ ان کے اخلاقی ستودہ اور اوصاف حمیدہ کے بارے میں ملتی صاحب لکھتے ہیں:

واجد علی شاہ سی و دو سال بعد اختراع سلطنت در مصاب شہیدہ
از جسی خوش و فوت والدہ و برابر و ولدش و حقین صد ہزار روپیہ
ماہ دار ہادی و گرفتاری کز و فر شہریاری، کمال تواضع و خاکساری و
مزاوردی و نماز گزاری و غرب پروری و ہر گسری شہید و شعار خود
ساختہ و طرح عبادت سازی بخش و نکامے کہ چرخ زندگاری
نرمیدہ انداختہ۔ و زیادہ از نصف شہریہ خود برائے ملازمان و
کارگزاران مقرر ہ پادشاهی فرما پداختہ و در تعلیم و توفیر حقیر بچہ
و قند فرد نکذاشتہ۔ روزے ہر ما برداشتہ مثل عادات پیشہ سرمن
از قسمن تا مسجد کہ خیلے ماہ بود زیادہ رفتہ۔ روز دیگر مرا طہیدہ۔ در
اشائے کلہ و کلام گفتہ۔ شاہ خاتم السلاطین مستید۔ گفت بعد از من
سلطنت نخواہ ماند۔ برائے تسکین خاطرش گفتہ خاتم یعنی بکشتاری
آمدہ است۔ خلاصہ ہا من عظیم حقیدہ داشت۔ لکن صحبت حاسدین
و مقصدین او را نکذاشت کہ اشامبت دین با حاکم ہو بہ
رسد من شود۔

ملتی صاحب نے واجد علی شاہ کی تاریخ وفات یوں لکھی:

واجد علی آں اختر ما قیر اعظم شد تیرہ و چار از غم مرگش بہ عالم
آں عمر کرم رفتہ ازین گھٹن ثانی کز دے شدہ بر خار چو گل تازہ و غم
دست اجل از غیرہ زندگاری افکاک ہو بجگر خستہ دلاں ساختہ مرہم

شیدائے حسینؑ اپنی علیؑ بود و غم او گروید دوبا سوم ماو خرم
کنز افترا بود و بپانی ز وقاش بے درہم و دینار شدہ درہم و درہم
تاریخ وقاش چو ز من خواست دل من
کفتم "وہ اسلام دلا وقت ز عالم"

مفتی صاحب کو فہم شعر سے خدا داد مناسب تھی۔ عربی، فارسی، اردو، تینوں
زبانوں میں ان کا مذاق سلیم تھا۔ انہیں ان تینوں زبانوں پر حیرت انگیز قدرت حاصل
تھی۔ نمونے کے طور "بجے نقطہ" کی مثال پیش کی جاتی ہے:

عالم مرام عدل و داد سالک مسالک صلاح و سیر او مالک
ممالک ولا و داد، محرم اسرار کردگار، مریم دلی سوگوار، سردار اہل
کرم سر کردہ اولوا الہم، ملا محمد اسلم سلمہ اللہ الاکرم۔ اہم مرام و
اقل کلام حصول مہام امور و وصول حال سرور۔ دیگر محروم طور امداد
کندہ مکرمہ و حرم رسول اللہ و محال مطہرہ امام دلدل سوار و آل
اطہار دار۔ تمام عدم مال و درہم سیر راہ نامول کہ اعطاء ماہ وار
دوسر ماہ را حکم حکم حوالہ کلکب گوہرہ سلکب کرد، کہ درہم معدودہ
در رسد و کام دل روا کرد، دوسر نظر کلام حاصل را ردی اصلاح
ارسال کرد۔

سرم را کہ سودا عطا کردہ ہمہ درہم سر را دوا کردہ
سحر دور گردد ہوا و ہوس سحر در سحر ہا دعا کردہ
ہمہ سال و مہ دارم آہ و الم کہ ہر سال و مہ کار ہا کردہ
مرا کار گردد گرہ دور گرہ گرہ ہا کہ در طرزہ ہا کردہ
سر آہ دلا راہ صبر و دلا کہ طویل اہل را رہا کردہ
دہ لعل ہم کام دلہا عام کہ اہل ہوں را صلا کردہ

دہ طول در داو مہر و کرم
اگر وعدہ وصلی ما کردہ

ملتی صاحب کی غزلوں کا دیوان غیر مطبوعہ ہے۔ غزلیں زیادہ تر واقعات کے حلقے ہیں۔ دیوان کی پہلی غزل نعت سے شروع ہوتی ہے۔ مطلع و مطلع کے دو شعر درج کیے جاتے ہیں:

اے مرید آستان تو عرشِ عظیم را و ز پاسے تو سراغِ رہِ مستقیم را
سید کہ کچھ تاب و توان در بدن نہ داشت ہرج تو زندہ ساختہ عظیمِ ربیم را
ذیل میں ملتی صاحب کی چند غزلیں اہلور نمونہ پیش کی جاتی ہیں۔ سلاست و روایتی طبع ہر شعر سے پیدا ہوتی ہے۔ اس غزل میں اپنی موجودہ حالت اور کھٹکتی حقائق کا ذکر کیا ہے:

گنبدِ شکستہ جہا را	کویم بجز شکوہ و طا را
یاراں کہ خطوط می نویسد	چہیدہ ہزار عقدہ ہا را
بجستہ بہ امیدِ امیں کہ کویم	تاریخِ حوادثِ قضا را
بدستہ بہ ہوائے امیں کہ سازم	چوں فرشِ حریرِ بویا را
امیں شکوہ ز جورِ چرخِ دارد	تا دورِ کسمِ اردو ہلا را
اے می عجبہ وسیلہ من	تازہ بدستِ پہ او عطا را
امیں فتویٰ و حکمِ شرع جوید	واں قلع و محترتِ دوا را
امیں کتبہٴ نظم و نثر پرست	دیں سورہ و آیہ و دعا را
خواہند رضائے خویش از من	با امیں ہمہ اختلافِ آرا را
تخما من و امیں بجا صفتِ خلق	کلف از نے و راہ سبکِ خارا را
پناری و رنج و فکرِ جہی	بیکارِ گلندہ دست و پا را
تقدیرِ سوالِ خلقِ سازم	با حیلہ پرستشِ خدا را
شد خج بہ بندہ جانِ شیریں	امیں عقدہ چہاں کسم گوارا را

چوں طہر کسم بزار تالی گویند نہان و آشکارا
اے چشم تو کور کر یہ تا کے

ہوئیں جواب خطِ ما را

اے گل از من حجاب تا کچھا بر عداوی نقاب تا کچھا
مرگ مانجہ بیل می آید سرکشی چوں حباب تا کچھا
لرزہ بر عرش و کرسی افتاد است اے دلم اضطراب تا کچھا
سالمہ شد کلام لطیف نیست اے خدا ایں کتاب تا کچھا
تغفل المرحیل بر پا شد

ستیا نوش خواب تا کچھا

تا کچھا درپردہ کدہائی من بر درت چوں شود رسائی من
دل ہوشاک عہد و بیان ست تو بہ ام چھست ڈاؤخانہ من
با گنہ ذوقِ آفریں دارم داسے من واسے خود ستائی من
دل پریشاں، دماغ آشفستہ دست و پا طالبِ ہدائی من
ی کسم آہ دور از منزل آہ از ناوک ہوائی من
پردہ از روئے کار افتادہ من و ایں طامع کدہائی من
تقصیر بر من بہ پیشانی جانب کعبہ جبہ سائی من

ستیا آنکہ بہت کار مرا

می کند خود گرہ کشائی من

برہوں رقم دلا زیں خار زار آہستہ آہستہ
نفس از ناتوانی سبکِ رام زندگی بودہ
غلش ہاسے علاقہ سخت گھبرا بودہ خاطر
ز تقدیر عمر در کفِ دایم کا بین حور عین
من زارم نکلاں می خود از بادِ سحر گاہاں
رسیدم بر در آں گلخوار آہستہ آہستہ
گر کسم بر سر منزل قرار آہستہ آہستہ
ز پاسے دل کشیدم خار خار آہستہ آہستہ
رہود ایں مایہ از من روزگار آہستہ آہستہ
شدم بردوش ایں مرکب سوار آہستہ آہستہ

مئی دارم کچا شد کاروانی عمر ما منزل در اے دل صدا زد چند بار آہستہ آہستہ
 بود نازک تر از تو اے صبا جسے کہ من دارم
 قدم پر مرقد سید گزار آہستہ آہستہ
 کھلاے فن کو لکھو سے ایک محبت تھی۔ یہ جذبہ مفتی صاحب کی ایک غزل
 سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

گرچہ زائل شد شباب لکھو عشوہ با دارد جناب لکھو
 ہست در نکلستہ گریم و زری کیا باشد تراب لکھو
 غیرت معصوم ہائے عالم است شہر دیوان خراب لکھو
 ہمسفر بلبل شیراز ہست در نوا نخی خراب لکھو
 لب فرو بہتی اگر سستی ظہر باریاب قاریاب لکھو
 می دہ یاد از نصیم پشت خلد لطف و عیش ہے حساب لکھو
 ہر کہ رفت از لکھو خوابش بود در خیال خورد و خواب لکھو
 مفتی صاحب کو جملہ اصناف سخن پر دستگاہ حاصل تھی۔ انھوں نے حدود
 قصیدے کہے ہیں۔ عربی کے مشہور قصیدے ”ترجمہ اشوق“ پر ایک قصیدہ لکھا۔ وہ سید
 گلشن کرتے تھے:

عربی:

جہاں بکشم و دورا کہ چچ شہر و دیار نیاہم کہ فردشہد بخت در بازار
 سید:

ترا کہ نیست بکف چچ درم و دینار چہ سود ازیں کہ فردشہد بخت در بازار
 سر کہ شد تر و شاداب گلشن اقبال
 ز آشیاد برآمد ہائے زریں ہال

مفتی صاحب نے مہرِ نجام کے کلام کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ ان کے جواب میں

بہت سی رہائیاں کہیں۔ چند رہائیاں ملاحظہ ہو:

خیام:

من نے خرم دہر کہ چوں من اہل بود نے خود دل او پیش خدا سہل بود
نے خود دل من حق ز ازل ی دانست گر نے خورم علم خدا چہل بود
ستید:

نے خود دل تو پیشہ نابل بود سخت است عذاب و خوردش سہل بود
در فعلی تو علم حق نہ دارد تاثیر پس نسبت فعل حق چہل بود
خیام:

ناکردہ گناہ در جہاں کیست، گو آگہس کہ گنہ نہ کرد چوں زیست، گو
من بد کسم و تو بد مکافات دی پس فرق میان من و تو چیست، گو
ستید:

حق و کرم از خدا مگر نیست، گو در بہت پس اعتراض تو چیست، گو
کہ در عوض ستم کوئی بکند پس عدل چہ چیز و صاحب کیست، گو
ملتی صاحب کی ایک غزل بروزی رہائی ملاحظہ ہو:

فریاد کہ فریاد سے نیست مرا جز دردِ دلم ہم نفسے نیست مرا
یارب تو بفریاد من خستہ برس غیر از تو بداریاں کسے نیست مرا
گدسہ یارایا وطن آہ چہ شد در دور بجز خار و نفسے نیست مرا
دھڑ عزیزان و شکست ست دلم داس قافلہ آکٹوں جرے نیست مرا
در حق امانات چہ تدبیر کسم جز دردِ دلم جا مسمے نیست مرا
خواہم کہ مرا دا بگذارند بہن از غلطی جز ایں ملتے نیست مرا
ستید شدہ ام میر ز گلزار جہاں

جز دیدنا جفت ہوئے نیست مرا

تاریخ کوئی: ملتی صاحب کو اس صبح خاص میں کمال حاصل تھا جو بڑے

بڑے شاعروں میں بھی نہیں تھا۔ استخراج مادہ تاریخ ان کے لیے اسی طرح آسان تھا جس طرح نظم کر لیتا۔ بغیر حرج اور تکیہ وہ بہت جلد تاریخ نکال لیتے تھے۔ موصوف کی جس قدر تاریخیں میری نظر سے گزریں وہ سب ہٹائے سے بالامال اور صفائی سے ہم دوش ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں سوائے تاریخ گوئی کے دوسرا کام نہیں کیا۔ لکھنؤ کے مشہور معاصر اور علما کے حزاروں پر ان کی بے شمار تاریخیں کندہ ہیں۔ اگر ان تاریخوں کا مجموعہ مرتب کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب ہو جائے گی۔ چند تاریخیں درج کی جاتی ہیں:

(۱) تاریخ وفات سید العلماء سید حسین قبلہ فرزند عفراس کتب:

فغان ز رطب بہرام سید شہدا کہ عیست بیچ کس او را دریں زماں ہوتا
ہیں کہ ہر طرف افتاد شور ماتم او بکربلا و نجف، ہند و یثرب و بلخا
فرا گرفت مصیبت بہ مسلم و کافر زدن بر سر و صورت اخیہ و اعدا
یا زیارت ایں قبہ شریف مکن کہ ی رسد طائف ز آساں اینجا
گزار پائے ادب سال فوت او برخواں

”حزار مرقدہ پرنور سید العلماء“

”ادب“ کے ۷ اور آخری مصرع کے ۱۲۶۶ نکلتے ہیں۔ کل اعداد ۱۴۷۳ ہجری

کے ہوتے ہیں:

(۲) تاریخ طبع کتاب ”جنس بازو“

دھیم سید تاریخ طبعش عجب مہر روشن برآمد ز مطلع

(۳) تاریخ روزنہ فضل حسین (۲۳ شعر)

روانش صفا و مرغوب و موزوں چہ بیچ ز ایات رنگیں نکارے
کلم بر شا عرض تاریخ روزنہ جہان مسلم باشد حزارے

(۳) تاریخ ہے عمارت لکھنو، مصلیٰ حسین آباد:

برہم مصلیٰ و مصلیٰ بادشاہ عصر کاوصاف او ز حاتم و کسریٰ توں شنید
آوازۂ بجائے عزا خانہ کہ ساخت درخش درخش جہت لقاہ و ہفت آساں شنید
ستید دریں مقام رسید و ہجتم دید کھینچ کہ از ارم و از جہاں شنید
چہ بر ضرب پاک کھو من اوقاد آہے دم ز کوشی کر آساں شنید
یا حذا عجیب مقامے کہ از ازل نے چشم چرخ دید و نہ کوشی جہاں شنید
سال پناش ما چہ دلم کرد جتو آواز گریہ از ملک پاساں شنید
گفتا تیں برقعہ انور نوشتہ ایم

انجا نواسے تالہ زہرا توں شنید

اسی عالی شان عمارت کی تعریف میں ذیل کی عبارت بھی نہایت لطیف

تحریر کی:

سبحان اللہ! عجب مکانے دل کشا کہ بیحد عجز سرشت ما یادی
آرد۔ و بر ارم ذات اہماو خاک حسرت ی بارہ۔ کھینچ چوں
مطر دیدہ منور و مفسس از ممکن سینہ صاف تر، قہہ طلاکش روکش
آفتاب تابان و جہۂ بیتا کش حیرت بخش گروان گرواں، خوش از
لال سلسیل مسجہ زن و روش پابکات عدل ہم خن۔ خاش
پاخیرۂ صندل آلود و نسیم کدورت دہا دورہ۔ روئے زینعل
آئینہ رخسار حور العین و شکوۂ ریاضش پر تو انوار غلد بریں۔ سبحانہ ما
اعظم شایۂ آساں ما بجائے قطرہ در بحر ہاید انداخت۔ آگاہ شدہ
از عجب رفعت سر قوم توں ساخت۔ مرغ وہم در وسع آبادش
پر و بال ی ریزد و طائر خیال از اوج طیفش برنی خیزد تاہم
نگار کیاں بر آں مکان ی افتد۔ تار نظر ہماں فضا کش ی بیچد و

ہیکویش نمودار جزائر خالعات است و ستونہائش و عاتم سادات۔
 فروزش چوں فنون علم معظم و اصولش چوں اصول دیں محکم۔ اما
 باہرہ دل کشتی ہوش رہا است۔ چہا کہ مرزا خانہ ستید شہدا
 است۔ رنگ آمیزی جہادش از خون دلہا و شور انگیزی بلہائش چوں
 فریاد تھلہا:

تعالے اللہ تجب ماتم سراے کہ باشد در کنارش کربلاے
 صدائے بلبل اغنا دردناک است قباے ہر گل از غم چاک چاک است
 کشتن ی زند گلابک خونبار مگر خون جگر دارد بہ حقار
 سرور مناکش یاد آور قامت جوانان حسین علیہ السلام و موج خیزے
 جیونش تذکرہ طلوع اہلبیت کرام۔ سبزہ زارش ہر یک غیمہ ہاے
 رنگاری و از بلو اشعارش افسردہ تر از دلہاے نگارے۔ سرنی گھا
 بیش دہماے امام مظلوم و شورش بلہائش سراج شیون نوب و ائم
 کلثوم۔ شہادتش ہمان جگر پارہ ہاے امام حسن و قادش بر یاد
 کلگون قباے کربلا کو تو زن۔ آبشارش منی چشمہ فرات در جوش و
 غنچہ ہائش مایہ اہل سیر و نبات خاموش۔ حصونش از فریاد غم پشت غم
 ز رویش الم و برہم و برہم۔ سہلش ماناے خواطر پریشان۔ نوازش
 منی ریختن خون فشان۔ کشتن چوں شمع گل شدہ بے دور و دستش
 چوں لہباے تپ زدہ کہو۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ علوم ادبیہ میں مفتی صاحب کو وہی شرف
 حاصل ہے جو اور علوم میں غفراں کتب مولانا سید الدار علی صاحب کو حاصل تھا۔ وہ
 اپنے عہد میں اس کے مجدد تھے۔ قریب قریب اس فن کے جس قدر کامل ہندوستان میں
 نظر آئیں گے ان سب کا سلسلہ تکتہ آخر میں مفتی صاحب تک جتنی طے گا۔ علوم ادبیہ
 ان کے لائق اور وجدانی فن تھے۔ انہوں نے کسی سے ان کو حاصل نہیں کیا اور نہ شعر

پر بھی کسی سے اصلاح لی۔ خود فرماتے ہیں:

بود ذوقی خدا دادم بایں فن نہ شاگردم نہ استادم و دریں فن
مفتی صاحب نے عربی، فارسی، اردو نثر و نظم، تفسیر، فقہ، حدیث، رجال،
نعت، وایت غرض بے شمار علوم و فنون پر سیکڑوں کتابیں لکھیں جن میں سے سو کے قریب
شائع ہو چکی ہیں۔ جناب مرتضیٰ حسین فاضل نے ۱۹۳۷ء میں مفتی صاحب کے مؤلفات
کی تین الماریاں دیکھی تھیں جن میں ان کے قلمی تصانیف روی کی طرح بھرے ہوئے
تھے۔ کچھ مؤلفات راجا صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ مزید لکھنوی
نے مفتی صاحب کی تصانیف کی تعداد ۱۶۴ لکھی ہے۔ ان میں ذیل کی مشنویاں بھی ہیں:

- (۱) من و سلوٹی (۲) گوہر شاہور (۳) آپ دلال (۴) جہر
- معلوم (۵) بیت المیزان (۶) سخن چمن (۷) نظم المروزی (۸)
- خطاب فاضل (۹) تسکین مسکین (۱۰) شمع الجہانس (۱۱) مرصع
- (۱۲) مولیٰ المظاہر (۱۳) موجزہ راہداری المیزان (۱۴) نور
- (۱۵) ردّ دوا (۱۶) حلقہ حیدری (۱۷) بنیاد اعتقاد (اردو)

مفتی صاحب کی اردو نثر و نظم:

طبقات میں پانچوم عربیت اس قدر غالب ہوتی ہے کہ فارسی یا اردو کا خالص
لفظ ان کی زبان میں نہیں ملتا۔ مگر یہ شرف بھی مفتی صاحب کے واسطے ہندوستان میں
مخصوص تھا کہ عربی زبان کی لوا سنجیوں میں وہ رشک حسان داشتی تھے۔ مفتی صاحب
ہمیشہ اردو زبان سے اپنی اجنبیت ظاہر کرتے تھے۔ چنانچہ مشہور ”بنیاد اعتقاد“ میں
فرماتے ہیں:

ماہر زبان ہند سے دلف میں نہیں ہندی کے روزمرہ سے آگاہ میں نہیں
تازی و فارسی کی تو کچھ مٹتی بھی ہوتی ہندی کی مجھ کو فکر نہ اب تک کبھی ہوئی
مفتی صاحب کی نثر کے نمونے نایاب ہیں۔ مشکل سے ایک دفعہ ملا۔ تحریر

ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

مہدی بیگم صاحبہ! میں خود قرض دار ہوں اور ذریعہ پار ہوں اور
تقویٰ میں گرفتار ہوں۔ چاہا تھا کہ میرا قرض سوداگر سے قرض
لے کے اپنے خرچ میں لاؤں۔ تم کو دس روپے دلوایں۔ ادھر
میں نے یہ خیال کیا، ادھر انہوں نے انتقال کیا۔ میری کیا تعمیر
ہے، تمہاری تقدیر ہے۔ مگر تم نے پھر خط بھیجا ہے اور میرے پاس
ایک روپیہ نہیں۔ لیکن ایک شخص کی امانت رکھی تھی۔ اس میں سے
دس روپے کی ہٹدہ کی۔ پیسے بھی اسی میں سے لیے اور بابت
رجسٹری خط کے دیے۔ تم اس کو خرچ کرو اور حکم خدا کرو اور
میرے حق میں دعا کرو کہ قرض میرا بھی ادا ہو اور آخرت کا بھلا
ہو۔ یہ اتنا س میری قبول کرو۔ چار آنے کم دس روپے وصول کرو
اور توپ کرو، خدا سے ڈرو، تم نے یہ لکھا کہ والد ہیں تو آپ ہیں،
خدا ہیں تو آپ ہیں۔ معاذ اللہ! میں بندۂ ناجیز گنہگار کہاں، میں
کہاں، پروردگار کہاں!

نیم دس جوالا تاتھ کی دکان چوک میں سنی ہے اور ہٹدہ کی درختی ہے۔
مفتی صاحب غزلیں بھی خوب کہتے تھے۔ ذیل میں چند غزلیں درج کی جاتی
ہیں، زبان کی فصاحت اور سادگی کا کلی لحاظ ہے:

شام سے صبح ہوئی، مرگ کا ساماں نہ ہوا
ملکِ حسرت سے بھی آلودہ یہ داناں نہ ہوا
بن بیضا، زور گٹھا، جھل گیا، علم آیا
تو مگر اپنے گناہوں سے پشیمان نہ ہوا
واعظ و شاعر و عالم، طیب و زاپد
سب میں مشہور ہوا، حیف ہے انسان نہ ہوا

دل و تمویذ و دعا، تسویہ کانونی شفا
سب ہوا، پر دل پُردرد کا دریاں نہ ہوا
صبح ہے فصل بہاری کی مگر دل بے نور
صبح کا گل ہے کہ اس فصل میں شہاں نہ ہوا

روئے محبوب کی کچھ یاد نہ کی سید نے
صاحب علم ہوا، حافظ قرآن نہ ہوا

کیا ہو گئے وہ دن کہ غرور شباب تھا
کیسا سرور اور نشہ بے شراب تھا
کچھ غم نہ مرگ کا نہ معیشت کی نگر تھی
نے کچھ خیال حشر نہ خوف عقاب تھا
فطرت میں کس مزے سے گزرتی تھی زندگی
جو لطف کم سنی میں اٹھایا، وہ خواب تھا
لفکوں کی بھردی نہیں کرتے ہیں عقلمند
جو غور سے حیات کو دیکھا، شباب تھا
دامادگانِ رام کا کیا پوچھتے ہو حال
کوئی سوار تھا کوئی پاؤں در رکاب تھا

وصلت کی شب کو کچھ نہ ہوئی گنگو بہم
ابن کو غرور حسن تھا، ہم کو شباب تھا

دینت نہیں ہے، رنگ نہ پوچھو خطاب کا
یہ ماتی لباس ہے فوسل شباب کا
ٹٹتی ہے اک قفس میں یہاں صورتِ حیات
دیکھا ہے جیسے آب پہ نقشہ شباب کا

کیا بیش تھے کو ملا ہے دور شراب میں
 مت کر خیال عشرت پا در رکاب کا
 ابرو ہے صبح شعر تو وہ خال حلقہ
 نقطہ کنارہ صلیب پہ ہے انتخاب کا
 ہم کو تھمارے لطف کی امید کچھ نہیں
 پر خط نکھو اگرچہ ہو مضمون عتاب کا
 دل گرچہ ہے پرشت سلامت سخن میں ہے
 جب تک نہ ہو شک تو مزہ کیا کہاب کا
 قاتل کو ہوش آتا ہے میرے کلام سے
 چکا ہے جو قلم سے عرق ہے گلاب کا
 ہے اس قدر زکات سے نفرت کہ طفل و جد
 کتب میں نام بھی نہیں لیتے نصاب کا
 کھاتے ہیں سود روز و شب اس کا حساب ہے
 آتا نہیں خیال بھی روز حساب کا
 آنکھوں کا نور عالم بھری نے کھو دیا
 گل کر دیے چراغ کہ ہے وقت خواب کا

ستید ہے خاک میری نظر میں سر و تاج
 ہے عشق آب و گل میں مرے پیراں کا

اپنے ہر سے اہل ہر بہرہ در نہیں
 کمال کو کچھ کمال پہ اپنے نظر نہیں
 اہل نظر کو لطف جو ملا ہے سخن کا
 خود صاحب جمال کو اس کی خبر نہیں

لڑیاں ہیں موتیوں کی اسے نظم کیا کہیں
ہم سنگ ان کا درج میں کوئی کھر نہیں
یہ ہیں جواہر ان کا طلبکار ہے فقیر
تم ہو غنی جو قدر حصیں اس قدر نہیں
شیریں خنن کو اپنے خنن میں مزہ کہاں
جی بھر گیا ہے رنج و شکر نہیں

کیا جانے اپنا حال کہ کتنا بلند ہے
جب تک نگاہِ عرشِ بریں فرش پر نہیں

شہیدِ عشق ہوا میں، تو کیا تعجب ہے
ترا حزار پر آنا بسا تعجب ہے
پیش ہے قلب میں اور آہِ سرد ہے لب پر
یہ گری اور یہ خطبہ ہوا، تعجب ہے
گزر ہوا کا بھی ہرگز نہیں ہے اس گل تک
پیامِ وصل کا کس نے دیا، تعجب ہے

طلب وہ کرتے ہیں جاتے نہیں ہو تم سید
عجب ہے آپ سے، اُن سے جدا تعجب ہے

ملتی صاحب ایک مرتبہ کان پور میں قیام پذیر تھے۔ مکان میں آگ لگی تو
ذیل کا قصہ نظم فرمایا:

حالت تھی کل ہماری جب بچ و تاب کی
دل جل رہے تھے دھوم تھی بس آپ و تاب کی
سویا تھا میں کہ آگ کا اک ہار غل ہوا
اٹھا تو کچھ خبر نہ رہی فزنی خواب کی

دیکھی لپک تو دل نے کہا بھر کے آو سرد
دورخ کی آجج ہوئے گی کس الہاب کی
مطبخ میں جب کہ آگ لگی بارغ کے قریب
پھولوں کی شامیں بن گئیں بیٹھیں کباب کی
اترا نہ تھا جہوز گل سرخ شاخ سے
پوندیں لپک رہی تھیں زمیں پر گلاب کی
اس گل سے کوئی پہچنے کہ بلبل کا کیا گناہ
کیوں بارغ میں دیکتی تھی آتش عذاب کی
جب تک کہ پہنچے پانی وہ برباد ہو گیا
اس آگ نے جن کی بھی مٹی خراب کی

ستید یہ کس کے عشق کا جوش و خروش تھا

ہے یہ نزل تمہاری جب آب و تاب کی

مولوی میر محمد جعفر صاحب مرحوم مجلس امید جو خاندان انتہاء کے ایک رکن

تھے اور ملتی صاحب کی خدمت میں بہت حاضر رہتے تھے، ایک روز آئے اور کہا کہ

جناب، آج میرے یہاں مشاعرہ ہے۔ آپ کو بھی زحمت دوں گا۔ ملتی صاحب نے

خس کر فرمایا کہ مشاعرے میں میرا کیا کام ہے۔ انھوں نے بے حد اصرار کیا۔ راضی

ہو گئے تو تشریف لے گئے۔ شیخ تاج کی مشہور نزل کی طرح تھی:

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ بھراں کا

کنول گردش کرتا ہوا ملتی صاحب کے سامنے آیا۔ لوگوں نے اصرار کیا کہ

حضور بھی کچھ پڑھیں۔ چند شعر جو وہیں نظم کر لیے تھے، پڑھ دیے۔ تمام مشاعرہ اٹ

گیا۔ ایک شعر اب تک لوگوں کو یاد ہے:

مری کے صبح تک امیدوار وصل اسے گردوں

ابھی سے ماتی کیوں بڑھن ہے شام بھراں کا

سلطان عالم و اجد علی شاہ کا یہ شعر کسی نے سنایا:
 شانہ کر کے ہال رخساروں پہ کیوں بکھرا دیے
 آئینوں میں بال ڈالے، اس سے کیا حاصل ہوا
 آپ نے فورا بے ساختہ یہ شعر نظم کیا:

حسن اہم سے عجب زینت ہوئی رخسار کی
 یہ ہال ایسا ہے جس سے ماہ بھی کمال ہوا
 کسی نے خوبہ حیدر علی آتش کے یہ دو شعر سنائے:

دل لگی اپنی ترے فکر سے کس رات نہ تھی
 صبح تک شام سے یا سو کے سوا بات نہ تھی
 التجا تھم سے کب اے قلندر حاجات نہ تھی
 تری درگاہ میں کس روز مناجات نہ تھی

مفتی صاحب نے فی البدیہہ یہ شعر کہے:

نہ ہوئی رات کو توفیق نماز شب کی
 ذکرِ معبود کیا کرتے تو کچھ بات نہ تھی
 ہوش آیا جو جوانی میں تو بھری آئی
 شب کو اس وقت کھلی آنکھ کہ کچھ رات نہ تھی
 ذیل کے شعر بھی مفتی صاحب سے یادگار ہیں:

عباس روز حشر پکارے گا برلا
 لوٹا مجھے بتوں نے، دہائی خدا کی ہے

مفتی صاحب کو ٹیپ رہائی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ ذیل کی رہائیاں
 نمونے کے طور پر درج کی جاتی ہیں:

(۱) بھری بھی عجب غم کا افسانہ ہے
 اس صبح کو خواب، مرگ کا آنا ہے

- طاقت کا ہے یہ حال کہ جنبش ہے محال
اس ضعف پہ دیکھو کہ کہاں جانا ہے
(۲) بے تلی دل نے شب کو سونے نہ دیا
پاس اوب عشق نے رونے نہ دیا
نہ زندگی وصل نہ مرگِ فرقت
تقدیر نے کوئی کام ہونے نہ دیا
(۳) برسوں ہے خیالِ عذرِ خواہی دل میں
ہرگز نہیں کچھ خوفِ الٰہی دل میں
نانے کی طرح خطا میں کی عمر بسر
ہالوں میں سفیدی ہے، سیاہی دل میں
(۴) حائل نے کبھی نہ دل کسی کا توڑا
ہاں توسلِ نفس کو لگایا کوڑا
جو امر کہ دیں گا ہے اسے آپ بکھا
دنیا کے امور کو خدا پہ چھوڑا
(۵) جب معرکہ حشر میں جانا ہو گا
جو آلِ نبی نہیں ٹھکانا ہو گا
روڈِ ظلمِ شاہ میں، بخشش لے لی
آنسو کا بہانہ ہی بہانا ہو گا
(۶) اک دن سفر اس جہاں سے کرنا ہو گا
گر لاکھ برس جیسے تو مرنے ہو گا
حیات نہ رہے وہ شریعت پہ قدم
کس طرح صراط سے گزرتا ہو گا

(۷) کیا غل ہے خیال طوق سجاد نہیں
فریاد کے موقع پہ یہ فریاد نہیں
بھلس میں طلب ہے دمدم پانی کی
کیا کھنگنی حسین کچھ یاد نہیں

مفتی صاحب مشہور مرثیہ گو مرزا دیر اور میر انیس کے نہایت قدردان تھے۔ دونوں کے کلام کو پسند کرتے اور اسے بلند پایہ قرار دیتے تھے۔ دونوں بزرگوں سے مراسلت بھی تھی۔ دیر کو ایک جامع الکملات مجتہد سمجھتے تھے اور ان کے کلام سے محفوظ ہوتے تھے۔ مفتی صاحب نے مثنوی ”سن و سلوئی“ لکھی۔ اس کی تاریخ طبع میں مرزا صاحب لکھتے ہیں:

بیت او بیت الحرم را در نظر چوں جمال یوسف و چشم بدر
مصرعش طوبائے فردوسی بریں مثل اردو بر ہر بالائیں
مطلع روشن مثال نخل طور ی کند چشم از فروزش کس نور
آرے آرے نیست چائے گلگون تر عادی از شاے ظلم او
تالیش طلاء عالی جناب سینہ اقدس بناو شیخ و شاب
قلہ اہل یقیں لاریب فیہ دامنہ و مفتی و محتاط و فقیہ
صدر پاکش صدر الہام غیب روز و شب گوش و دل پیغام غیب

مصرعے لکھتے چے تاریخ آں
کچھ عہد معنی و ظلم رواں
۱ ۲ ۳ ۴
جری

پچھنے کی ایک مجلس میں مرزا دیر نے گھوڑے کی تعریف میں یہ مصرع کہا تھا:
اس رخس کے منہ پر کوئی دن چڑھ نہیں سکتا

اس پر ۲۰ شعبہ ۲۰ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ (اکتوبر ۱۸۵۹ء) کو کسی نے اعتراض کیا۔ مفتی صاحب نے اس اعتراض کے جواب میں دغاں حکمن جواب دیا تھا اور دلیل میں نکلائی، مرقی، ناصر علی سرہندی اور تاج کی مثالیں پیش کی تھیں۔ مرزا صاحب نے

مفتی صاحب کے دعاؤں شکن جواب پر شکر ہے کا خط لکھا تھا۔ تحصیلات ”تجلیات“ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ شعر یہ ہیں:

مرتی:

اں سبک سیر کہ چوں گرم حنائی سازی
از ازل سوے ابد و از ابد آید بہ ازل
فلکرا کش دم رفتن چکد از چرخانی
ہجتم آسایش نصیب کبیر رحمت بہ کشف
گر بخورشید وہ سر صبت او در یکدم
آید از طور ہر صوب منازل بھمل

تلی:

در ملک فنا ہم غلیم اکامت
از بسکہ علی تجز جہانیم فرس را

ناج:

ہے یہ اپنے ضعف کا روز ہدائی میں اثر
شام ہے اور دھوپ چڑھ سکتی نہیں دیار پر

مفتی صاحب میر انیس کے مذاہن میں تھے۔ ان کے خطوط کا ایک قلمی مجموعہ ”ظن ممدوح“ کے نام سے راجا صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس میں انیس کے نام حصہ خطوط ہیں۔ مشہور ہے کہ انیس نے مفتی صاحب کو ایک مرثیہ سنایا۔ اس میں یہ مصرع تھا:

جب حملہ در امام کریم انیس ہوئے

مفتی صاحب نے فرمایا، ”کریم انیس“ نہیں ”سبح انیس“ فرمائیے۔ میر انیس نے مفتی صاحب کی شہرہ ”من وسلوئی“ کی تاریخ طاعت میں لکھی تھی:

ملحی شد ایں لقم از فضل الہ در جلوں صحت مانوس شاه

مرزا غالب اور مفتی میر تقی میر

خامسے درگاہ رتِ دامنِ ظنِ حق واحد علی شاہِ دین
حسبِ حکمِ سیدِ مہرِ عیاں قہقہہ کوئیں استوارِ زمان
فاضلِ باذلِ فقیرِ بالیقین آفتابِ آسمانِ علم و دین
چوں عاملِ کرد با کلمہِ سلیس از چہ تاریخِ آن طبعِ انیس
داد ہاتھِ ایں صدائے دلپذیر

ہست تاریخش ”کلامِ بے نظیر“
(1857-1862) ۱ ۲ ۳

میر انیس نے مفتی من و سلوٹی کی جو تاریخِ نظم کی تھی اس کا ذکر مفتی صاحب نے ایک نظم میں یوں فرمایا:

بھیاں کز فیضِ سلطانِ ایں کلام یافت در آئینہ طبعِ ارتسام
شب کہ ہوم در خیالِ سالِ طبع ایں نوید آمدِ پاستھالِ طبع
کاغذِ آغازِ جلوںِ خسروی یافت سر انجامِ طبعِ مفتوی
دل چہ از روئے جلوںِ آگاہِ گفتِ گفتِ مطبوع از جلوںِ شاہِ گفت
مصرعے کمالِ ہم آمد در نگہِ گفتِ مطبوعِ جلوںِ بادش
باز تاریخِ دگر کرمِ طلب از چنابِ سیدِ والا لب
نورِ چشمِ مجلسِ صدق و صفا ذاکرِ مقبولِ سیدِ مصطفی
بلبلِ دستانِ زنی بستانِ ہمہ مادحِ میرِ عربِ حجابِ ہمہ
شامِ یکجا رکبیں ذاکرینِ تارکِ دنیا انیسِ اہلی دین
ارتھالا آں دھوِ روزگار

زو رقمِ ایں چند صیغِ آبدار

تذکرۃ بالا اشعار کے جواب میں میر انیس نے مفتی صاحب کو ذیل کا خط

لکھا تھا:

قلہ و کعبِ علومِ کیشاں دامِ شکمِ عالی۔ زبانِ ایں کج راج عیاں

را چہ یاما کہ مدح ایں اشعار آبدار نماید۔ الحق کہ دریں جزو نہاں
 طرز انجاز طرازی و سحر پردازی بر ذلت فیض آیات ختم گردید۔
 موقلم بودہ است کوئے کلکب مجر سلب تو
 صفیہ قرطاس را کردی نگارستان جیس
 از صحن الکمال نگاہ داشتہ سایہ ہا پایہ را نہر مفارق خادمان خاص
 بمسوط دار۔۔۔

میر انیس نے ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۳-۵۵ء) میں امام ازا تعمیر کیا تھا۔ مثنوی صاحب
 نے ۱۵ شعر کا قطعہ تاریخ کہا جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

”تاریخ بنائے عزاغات میر میر علی انیس ساختہ بود“

یکتاے عصر میر علی آں کہ مثلی او
 نے چشم چرخ دید نہ گوش جہاں شنید
 آں سید انیس لقب عذلیپ بند
 کاوصاف او تو اس ز زمین و راں شنید
 آں ذاکرے کہ گفت سر منبر آشکار
 رازے کہ جہر نکل بگردوں نہاں شنید
 آں نغز کہ سر نہ زد از طائرانی قدس
 وہ حیرت کہ لیلی کلکش چہاں شنید
 غیر از زبانی دل نوائے شا کند
 آنکس کہ نظم پاک دے از گوش چاں شنید
 نازک دے کہ ہر چہ بکشتہ گوش کرد
 اما نہ حال زار من تا تو اس شنید
 تعید نیم حرف ہم از سرگذشت من
 از دیگران اگرچہ وہ صد داستان شنید

آواز دے بناے عزا خانہ کہ ساخت
درخش جہت قنادر بہمت آہاں شنید
معاد وقت صعبہ ایں خانہ عزا
شاید کہ جیتے از لب آں نکتہ ماں شنید
ہر کس سر نیاز بر ایں آستان گزاشت
آواز خیر مقدم کزدیاں شنید
ہر ذرہ کہ بار دہیں بارگاہ یافت
آیات نور خود ز ہم خادماں شنید
جو بر خرچ پاک نگاہ من اوقاد
آپے ز دم کہ گوش کر آہاں رسید

سال پناش گفت رقم از سر الم

ایں جا عام تالہ زہرا توں شنید
۱۰۰۰ ۹۰۰ ۸۰۰ ۷۰۰ ۶۰۰ ۵۰۰ ۴۰۰ ۳۰۰ ۲۰۰ ۱۰۰

میر انیس کے انتقال پر مفتی صاحب نے کئی تاریخیں لکھیں۔ انیس کی مشہور
رہائی کا دوسرا مصرع ہے: ”جز خاک نہ نکلے نہ بچھوتا ہوگا۔“ مفتی صاحب نے ایک لفظ
بڑھا کر یوں تاریخ لکھی:

تھے انیس الفریا ذاکر و مداح امام
ہے یقین، بخش خدا دیہہ اعلیٰ ہوگا
اتھ کیا دار فنا سے وہ مہ برج کمال
کوئی دنیا میں نہ اس وضع کا پیدا ہوگا
موت کی یاد ہمیشہ تھی دل اقدس میں
جو کہا شعر وہ طہت غم افزا ہوگا

دع میں ان کی کسے طالع گویائی ہے
 کون ایسا ہے جو اس طرح کا گویا ہوگا
 سال تاریخ بھی گویا کہ کلام ان کا ہے
 ”ہاے، جز خاک نہ تھکے نہ پھوٹا ہوگا“
 ۱ ۲ ۳ ۴ ۵

میر انیس کے ایک مشہور سلام کا مطلع یہ ہے:
 ظم شہ کا گر داغ دل پر رہے
 سلامی لہ بھی موار رہے
 مفتی صاحب نے اسی انداز پر چند شعر نظم کیے:
 یہ تھی آرزو قتل شیئر کی کہ روزے سے اس دن منکر رہے
 ہوا عصر تک صاف زہرا کا کمر نہ اکبر رہا اور نہ امیر رہے
 اسی وقت ادھر سب کے روزے کٹے ادھر بھوکے آل پیہر رہے
 پریشان، سراسیمہ، بے سرپرست
 نہ بھائی، نہ بیٹے، نہ شوہر رہے
 انیس کے انتقال پر میر انیس نے مفتی صاحب کی خدمت میں ایک غزل بکس
 جہلم میں پڑھنے کے لیے برائے اصلاح پیش کی۔ غزل کا مطلع یہ ہے:
 ”از بارغ جہاں بلبل ہستانِ سخن رفت“
 مفتی صاحب نے اصلاح دیتے وقت فی الہدیہ ایک غزل کہا، جس میں
 انیس کی عظمت اور ان کی محبت ظاہر ہوتی ہے۔ چند بند یہ ہیں:
 یارب کہ جدا شد کہ جنس ہوش ربانیت
 مغموم و حزین خود سخن از درد جدائی ست
 افسردہ ز ہجرش چمن دہج سرائی ست
 از دستِ طمش سوز قرطاسِ جدائی ست
 خونِ جگر سے بیکہ ز حوکانِ سخن رفت
 از خامہ اور دلمچ سلطانِ سخن بود
 در قبضہ او صادم ز آلانِ سخن بود

مرزا غالب اور مفتی جرمہ ہاں

در مجلس او نصیب ایمانِ سخن بود از صحبت او بندش ارکانِ سخن بود
 از رطوبت او قدرت و امکانِ سخن رفت
 بود از گلشنِ مایعِ ذکاوتِ طراوت می زد ریش موجِ بدریائے سلامت
 می ریخت در گلشنِ شکر و شیر نصاحت بر خوانِ سخن بود ازو شورِ ملاحت
 تا رفت ہم نصیب ایمانِ سخن رفت
 در بزمِ رزا آئینہ دارِ شہدا بود تصویرِ کعبہِ معرکہ کرب و بلا بود
 باطنِ حسن بود انفسِ اطربا بود در مرشدِ گوئیِ نضرِ راجہا بود
 او رفت کہ سرچشمہ حیوانِ سخن رفت
 تا رفت بہ خنجرِ بلش افتاد بہرِ دل از سیبِ رہائش ہمہ محفلِ شدہ بے دل
 در ہند چو حسان و حسن بود چو شکیل ناگاہ سوسے روضہِ رضواں شدہ مائل
 چوں غنچہ نموشید و ز بستانِ سخن رفت

مفتی صاحب اور مرزا غالب

جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ مفتی صاحب اور مرزا غالب کے درمیان محکم روابط قائم تھے۔ یوں تو مرزا صاحب آزاد خیال کے تھے لیکن مفتی صاحب سے محبت و عقیدت کا جذبہ کا درما تھا۔ دونوں کے درمیان ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۴ء) میں مکاتبت کا آغاز ہوا۔ مفتی صاحب کے کتب خانے میں مرزا غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کچھ خطوط ایک کھنڈ میں موجود تھے۔ خط و کتابت کی ابتدا یوں ہوئی کہ غالب نے ”طالع بُرہان“ کا ایک نمونہ مفتی صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ اس کے لفافے پر عبارت ذیل درج تھی:

در کانِ ہر، ہرکانِ نواب ہاتر علی خاں صاحب موصول و بخندید

مخدومی جناب مفتی میر مہاس صاحب زادہ مجدد مقبول و دربارہ
عقیدہ اطلاع رسیدہ ارغوانی عنایت مہذول باو۔
مرسلہ چہارم اگست ۱۸۶۲ء۔ اسٹامپ پیڑ۔

جب ”قاری نرمان“ کا نسخہ جناب مفتی صاحب قبلہ کو موصول ہوا تو نواب
نور الدولہ لیٹ الملک محمد احسن خان بہادر محکم جنگ، معروف بہ نواب باور مرزا صاحب
نے اس کی وصول پالی کی رسید کی تاریخ نظم میں یوں لکھی تھی:

چوں غالب شہر سکرم	استاد سخنورانی عالم
آں غیرت صائب و نظیری	واں رعب مرئی و تلہوری
تجارت زبان و فصاحت	حتات عصر در بلاغت
در حضرت عالم محقق	آں قاضی کامل مدق
کز جملہ بھلم بیش باشد	علامہ عصر خویش باشد
سید مہاس ام پائش	و ز نور سرشت جسم پائش
صدیق لطیف ارغوان کرد	تحقیق خودش دود عیاں کرد
آمد بیاں پر ذکر تاریخ	رحیم صفا بفکر تاریخ

از لپہ فکر گوہر تاب
شد حیرت ارغوان نایاب

کتاب ملاحظہ فرمانے کے بعد مفتی صاحب نے ذیل کا خط مرزا غالب کو لکھا:

”یا سادۃ اللہ الغاب و منظر المجاہد

میں از اقدام برائے احتفال تحفہ سلام کہ نام اقدام خدام تو امد
چہ سلاسیک چوں ذرہ نجف در صدف شرف ہرودہ و در طالع انوار از
نکذہ زر تار آفتاب نصف النہار گوسے سبقت بردہ۔ مکتس آنکہ
تقریر شمریے حبیبیہ مثل مدح و نکاسے آں عطیہ از حیو بیان و

نظان ایں بچھاواں جودست۔ سبحان اللہ ظہیر کر استقام و یکی
 کریم، بتائیں ”قاطع نہاں“ کہ در انتخاب زمان نام و نظان
 برہان قاطع را برہم زدہ و زیر و زبر کردہ۔ یا پے پاس گزاری آں
 خسرو خاور شیریں بیانی و ناظم فکر و سخنہائی کہ امروز در شعر و
 شاعری نظیری ندارد۔ کسے در برابرش ظہوری ندارد۔ ہر گاہ در انجمن
 اہل سخن ذکرش برآید فروغی فراموش است و اگر در شہرستان قلم و
 نثر کوں ”لسن الملک“ زندہ زمانہ سراپا گوش:

در فن معانی یو بیضا دارد در بحر بیانی لب عیسی دارد
 کر شیوہ خطیان دیگر جادوست آواز گھنٹھ عصاے موسیٰ دارد
 نواب مستطاب محسن الدولہ انتظام الملک سید باقر علی خان بہادر
 جنگ کہ کتہ رست است یکتا و سجا طے است بے ہمتا۔ میری
 شعر:

از من بمن سلام و ہم از من بمن پیام
 رنج ولی مہاو پیام و سلام
 وجد کردند و کرد خوانندہ و فقیر از تاریخ قسم کہ میر غالب باشد نحو
 شدم کہ چہ قدر بے تکلف و پر تکلف است و تاریخ وصول ایں
 بدیہ از ہمیں ماہہ ایں صودت برآورد:

غالب آں میر سیر نظم و نثر مصغیر ساجد و طالب
 خندہ باہر از ہر ش رسید شد رقم تاریخ ”میر غالب“
 ۱۲۶۹ھ

حزہ اضعف الناس سید محمد عباس فی کلّ الاشغال و توزع الہل
 علی سبیل اللہ الاستعمال و الحمد للہ لسبحان واصلوٰ علی محمد وآلہ
 خیر آل:

اس خط کے جواب اور شکریے میں مرزا غالب نے ۱۹ صفر ۱۲۷۹ھ (جولائی ۱۸۶۲ء) کو ذیل کا خط لکھا تھا:

قبلہ حضرت کا نوازش نامہ آیا۔ میں نے اس کو حرص بازو بنایا۔ آپ کی حسین میرے واسطے سرمایہ عز و انکار ہے۔ لیکن فقیر امیدوار ہے کہ یہ دفتر بے معنی نہ سراسری بلکہ سراسر دیکھنا چاہیے۔ پیش نظر دھرا رہے۔ وقت فرصت اکثر دیکھا جائے۔ میں نے جو یہ نسخہ وہاں بھجوایا ہے گویا کسوٹی پر سونا چڑھایا ہے۔ نہ ہٹ و حرم ہوں نہ مجھے اپنی بات کی جگہ ہے۔ دیباچہ و خاتمہ متین میں جا بجا جو کچھ لکھ آیا ہوں سب سچ ہے۔ حقیقت کی داد جدا چاہتا ہوں۔ طرز عبارت کی داد جدا چاہتا ہوں۔ نگارش لطافت سے خالی نہ ہوگی۔ نگارش طرافت سے خالی نہ ہوگی۔ علم و ہنر سے عاری ہوں، لیکن کچھ برس سے جو سخن گزاری ہوں۔ مبدع فیض کا مجھ پہ احسان عظیم ہے۔ ماخذ میرا سچ اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسب ازلی و سرمدی لایا ہوں۔ مطابق اہل پارس کے منطق کے بجلی قرۃ العین لایا ہوں۔ مناسب خدا داد، تصنیف استاد حسن و قبح ترکیب بچانے لگا۔ فارسی کے خواہش جاننے لگا۔ بعد اپنی تکمیل کے علاوہ کی تہذیب کا خیال آیا۔ ”قانع نہ بان“ کا لکھنا کیا ہے۔ گویا ہاسی کرمی میں اہل آیا۔ لکھنا کیا تھا کہ سہام ملامت کا جوف ہوا۔ ہے ہے، یہ شک مایہ معارض اکابر سلف ہوا۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ ”قانع نہ بان“ کی ترکیب غلط ہے۔ عرض کرتا ہوں کہ حضرت برہان قانع اور ”قانع نہ بان“ کی ایک غلط ہے۔ برہان قانع نے کیا لکھا نتیجہ میں کہ قطع کیا جو آپ نے اس کو قانع لقب دیا۔ برہان

جب تک خیر کے برہان کو قطع نہ کرے گا کیونکہ برہان قاطع نام ہوگا۔ برہان قاطع کی صحت میں جس قدر تقریر کیجیے گا وہ "قاطع نہ ہان" کی صحت کے ثبوت میں کام آئے گی۔

قطعہ تاریخ کا کیا کہنا ہے۔ گویا کتاب معشوق اور یہ قطعہ اس کا کہنا ہے۔ جناب نواب صاحب کا نیاز مند اور قرماں بردار ہوں۔ بعد عرض سلام کے پسند آنے کا شکر گزار ہوں۔ آپ کے علم و فہم اور ادراک کی جو تعریف کی جائے وہ حق ہے۔ لیکن میرے شعر کی ستائش صرف خریداری دکان بے روثی ہے، انصاف کا طالب غالب۔ (مہر)

مرزا غالب کے خط کا جواب مفتی صاحب نے یہ دیا:
جناب والا سلمہ اللہ تعالیٰ۔ مکتوب مرغوب کو دیکھ کر مسرور ہوا۔ متعلق خاطر دور ہوا۔ لیکن کان پور میں بسبب ترقیاتی سرچسما کی نوبت نہ آئی اور لکھنؤ میں ملاقات احباب سے فرصت نہ پائی۔ کیا عرض کروں، میں بہت ناتواں ہوں۔ معذرت استخوان ہوں۔ رنجوں میں گرفتار ہوں۔ رحمت الہی کا امیدوار ہوں۔ اگر کچھ بھی دل و دماغ میں قوت پاتا اور فی الجملہ درس و تدریس اور تحریر جواب مسالک سے فرصت پاتا، اس رسالے کو از اول تا آخر دیکھ کر خود ذہن ناقص میں گزرتا، مفصل عرض کرتا۔

باشاء اللہ آپ کی نظم و نثر سے دل حیرے اٹھاتا ہے۔ جو صاحب ذوق ہے لغت پاتا ہے۔ اس نگارش نے کتاب دکنی کو نظر سے کرا دیا۔ صحن خط سبزان دکن بھلا دیا۔ اللہ ری شوقی کلام کہ چشم نوالان سخن کو حیرت ہے اور نہ لطافت و ظرافت کے اداسے تاننا طراز کو کیا نسبت ہے۔

سہامِ طام کا جو آپ نے شکوہ فرمایا ہے، حال اس کا یہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے، حضرت موسیٰ نے درگاہِ الہی میں عرض کیا کہ خدایا حیرا دم بھرتا ہوں، دو دعائیں کرتا ہوں، جنت مجھ کو عطا کر اور خلق کی زبان سے رہا کر۔ ارشاد ہوا۔ دعاے اذل قبول ہے، تو جلتی ہے، رسول ہے، لیکن دوسرا جو سوال ہے اس کا یہ حال ہے کہ ہم نے اپنے واسطے بھی نہیں کیا۔ غرض خلق کا خلق بند نہیں۔ وہ لوگ کم ہیں جو مردہ پسند نہیں۔

”قاطع نہ بان“ خوب نام ہے۔ اس میں کیا جاے کلام ہے۔ معنی صاف ہیں۔ معترض ناانصاف ہیں۔ لطف یہ ہے کہ خود نام سے پیدا ہے کہ اس نے نہ بان قاطع کو الٹا ہے۔ مگر ان دونوں باتوں کا ایک لطف یہ ہونا جاے قابلِ غور ہے۔ ظاہر اس کا مطلب اور ہے اور آپ کا مقصد اور ہے۔ قطع کے معنی کاٹنے کے اور یقین کے بھی آئے ہیں۔ اس نے غائب معنی ظانی مراد لیے ہیں اور آپ معنی اذل استعمال میں لائے ہیں۔ بہر صورت نہ بان کی طرف ظاہر قاطع کی اضافت ہے اور اس تقریب میں سراسر لطافت ہے۔ اس میں شک و ریب نہیں کہ ابہام میں حسن ہے۔ کچھ صیب نہیں۔ لیکن تقصیر معاف:

ظرافت نے آفت کو برپا کیا
درستی نہ کرنی تھی یہ کیا کیا
خیر گزشتہ مصلحت۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

شاہ اسماعیل دہلوی نے اپنی کتاب ”تقریب الایمان“ میں لکھا ہے کہ اگر اللہ چاہے تو بہت سے خاتم النبیین کو پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے جواب میں مولانا فضل حق خیر آبادی نے ایک رسالہ ”انتاع الطہیر خاتم النبیین“ کے نام سے لکھا۔ غالب

مولانا سے موصوف کو بہت مانتے تھے۔ کسی نے مرزا سے شاہ دہلوی کے نظریے کے بارے میں دریافت کیا کہ آپ کی رائے کیا ہے؟ دراصل یہ سوال الکلام سے حلق تھا تو غالب نے اس بارے میں سلطان اعلیٰ سید محمد قبلہ سے بھی دریافت کیا اور جو خط ان کو لکھا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

خداوند نعمت آیہ رحمت سلامت۔ حلیم و کونش و ذریعہ نیازی کہ
پیش ازیں پانچ ہایوں توفیق رواں داشتہ ام۔ ہر قول قرین ہاد۔
دریں ہنگام در شہر دو دانشمند باہم در آدینتہ اند۔ یکے کی سراید کہ
آفریدہ کار ہستے حضرت خاتم الانبیاء علیہ وآلہ السلام می تواند
آفرید۔ و ایں یکے کی فرمایہ کہ معنی ذاتی و محال ذاتی است۔ بندہ
چوں ہمیں عقیدہ دارد عقلے درگیرندہ بدیں بدعا سر انجام دادہ
است۔ ہر آئینہ چشم دارد کہ سواد بہ نور نظر اصلاح روشن شود۔ زیادہ
حق ادب، از غالب، لکشتہ بست و یکم جمادی الاولیٰ ۱۲۷۳ھ
(دسمبر ۱۸۵۶ء)

اے کہ ی گوئی توانا کردگار چوں محمد دگرے آرد بکار
باخداوند دو کشتی آفریں متعجب نہو تلمذی ایں جنیں
نور حقیقی نفوذ تر پایہ خط است آنکہ پنداری کہ ہست اندر نہفت
گرچہ فکر دور آرد ہم بقدر خاضعیت کم بود
صورت آرائش عالم نگر یک مد و یک مہر و یک خاتم نگر
اینگہ ی گویم جہاے پیش نیست مہر و مد زان جلوہ تابے پیش نیست
آنکہ مہر و ماہ و اختر آفرید ی توانہ میر دگر آفرید
گر دو مہر از سوسے خاور آورد کہ ہاد آں کو نہ ہاد آورد
قدست حق پیش ازیں ہم بودہ است ہر چہ اندیشے کم از کم بودہ است
لیک دو یک عالم از رویہ یقین خود نمی سمجھ دو ختم المرسلین

ایک جہاں تا بہت یک خاتم بس است قدرت حق را نہ یک عالم بس است
 از دل ہر ذوقہ بر آمد عالمے تا بود ہر عالمے را خاتمے
 ہر کجا ہنگامہ عالم بود رحمۃ اللعالمین ہم بود
 در یکے عالم دو خاتم را مجھے صد ہزاراں عالم و خاتم کیوے
 کثرت ابداع عالم خوب تر یا یک عالم دو خاتم خوب تر
 غالب ایں اندیشہ پدید ہم ہی خردہ ہم بر خویش ی کیرم ہی
 اے کہ ختم المرسلین اش خواندہ دائم از روئے عطیاش خواندہ
 ایں 'الف لائی' کہ استزاق راست حکم باطن معنی اطلاق راست
 فضاہ ایجاد ہر عالم کیے است مگر دو مد عالم بود خاتم کیے است
 خود ہی گوئی کہ نورش اول است از ہمہ عالم تہودش اول است
 اولیت را بود شانی تمام کے بہر فردے پذیرد انقسام
 جوہر کل بر نہاد حشیہ در محو وہ نیاید حشیہ
 تا نہ وری اند اسکاں رج و رنگ خیر اسکاں بود ہر مثل رنگ
 ہم اسکاں اعد احمد منوریت چوں ز اسکاں نگوری دانی کہ چست
 صانع عالم جنس کرد اختیار کس بعالم مثل بود زہماہ
 ایں نہ مجرست اختیارست اے فقیر خوابہ بے ہوتا بود لاسب فیہ
 ہر کما با سایہ نہ پندو خدا بچو ادنی نقش کے بندو خدا
 ہم کہہ سحر حیرش چوں بود سایہ چوں نبود نظیرش چوں بود
 منفرد اعد کمال ذہیبست لازم منش محال ذہیبست

زمی عقیدت پر نہ گرم استقام

نامہ را در ی نورم و استقام

تقریر تاریخ ۱۴ جمادی الثانی ۱۲۷۳ھ

(مطابق جنوری ۱۸۵۷ء)

غالب کے تذکرہ بالا خط کا جواب صوبہ ارشاد سلطان احمد خان صاحب ملحق صاحب نے تحریر ذیل میں دیا:

بعد اہلای سلام باکرام کے غفرای دیباچہ کلام و طوہای
دارالسلام اسلام است۔ مشہور خاطر خاطر باد، صیغہ مرسلہ مشتمل
بر مسئلہ و مضمون اشعار آبدار کہ مرسلہ بند اجیاد اذہان و انکار و ردق
فلکن بازار لکھی شاہوار بود، رسید۔ الحق کہ داوخن دادہ اند و تافہ
مغیب نقش کشادہ۔ سلاست مہانی بالاطحاب معانی ہام آہینہ و
مہابت علیہ بامضامین شعریہ در یک قالب ریختہ در قلمرو شعر و سخن
و نظم و انتظام تمام کہ از قدیم الایام معلوم بود۔ الحال توکل و
مداخلت در معقول و معقول زیادہ باصط سرور شد و نور علی نور لکن
ایں مسئلہ از علم کلام است و خوش درمی قن بر غیر خواص حرام و
اقتحام در شہادت ملکہ اشتہاء و غلط است و از چیزے کہ شادمان
مقدس بایں تکلیف نہ دادہ سکوت احوط بہر حال بالاہمال اعتقاد
باید کرد کہ قدرت الہیہ وسیع است و بر جمیع ممکنات و مقدرات و
ایجاد مثل جناب رسالت مآب فی نفس متع ذاتی نیست۔ اگرچہ
باقتدار خصائص عرضیہ مثل افضلیت و اولیت و خاصیت و اکسلیت
کہ نظر بآپ کریمہ "لکن رسول اللہ و خاتم النبین" و حدیث "اَؤل
ما خلق اللہ نوری" و احادیث کثیرہ دیگر مقرون بالیقین است بلکہ
از جملہ ضروریات دین ایجاد مثل و مانایں آن جناب بمولہ متع
ی باشد۔ لکن تقدس و حرۃ ذاتی از شریک نفس بجناب احدیت
است نہ از صفات بشریت و لہذا در حق خودی فرماید "ولم یکن لہ
کلوا احد" و بجناب رسالت مآب خطاب فرمودہ کہ "قل الما انا بشر
مکم" کاتب ذواست نکتہ والاقب سرمدی نہ رسد۔ بحر و شان خداے

کس از خودی نہ رسد۔ و غالب کہ مفادِ ظلم غالب ہمیں مطالب
است۔ و استقام خیر تمام۔

ملتی صاحب کی ایک مثنوی ”خطاب فاضل“ ۲۵۷ ہے۔ اس میں بہادر شاہ
ظفر کے حکم کے قلمی کے علاوہ غالب کا بھی ذکر کیا گیا۔ چند شعر یہ ہیں:

حالا دیگرے ز قوم ذلیل رد نوشت است بر کلام غلیل
گرچہ روئے سخن بہ غالب بود لادش دفع آں خطاب بود
لیک غالب صلاح خویش نہ دید در تسنن صلاح خویش نہ دید
زانکہ بود است او ز اہل کمال نہ ز متحاب بود و نہ از ابدال
او نہ پالطج مرد جہلی بود ساج حکم شاہ دہلی بود
نامہ انویس کہ او گفتہ نیست آہم یقین کہ او گفتہ
بطریقش کلام ی ماند راز پوشیدہ را خدا ماند
نماہرا بودہ است اصل سخن
یا ز نوشاہ یا ز شاہ کہن



حواشی

۱۵۱ مضمون کی چوری میں مرزا محمد ہادی مزین لکھنوی کی کتاب ”تجلیاتِ امجد جہانگیر تاج شاہ“
(۱۹۲۵-۲۶ء) منظرِ نگاہ پر نہیں گھسوا سے استفادہ کیا گیا۔ کتاب بار ہے۔ اس کا ایک کھل قسط پر دفتر
میر مسعود کے کتب خانے میں موجود ہے۔

۲۵۲ کلیاتِ غالب میں ایک مثنوی ”ہجاءِ صومالیہ شای ثبوت و دلائل کہ در حقیقت چتر نورانی اور
حضرت ابوبکر است“ موجود ہے۔ اس میں حضرت رسالت مآب ﷺ کی شانِ ثبوت اور دلائلِ حق کی صحت
و صحتِ جان کی گئی ہیں۔ مثنوی میں ۱۹۸ شعر ہیں۔ غالب نے اس میں سے آخری ۳۸ شعر سلطانِ اہلِ

اور سال کیے تھے۔

۳۔ مثنوی صاحب کی ایک مثنوی ”خطاب قاضی“ ہے۔ اس میں بہادر شاہ کے حکم کے قصبے کے علاوہ غالب کا بھی ذکر موجود ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ بادشاہ دہلی نے 1020 ہجری میں بناری کے دوران اپنے مزاج حیدر شاہ سے صحت پانپلی کے لیے درگاہ حضرت عباس گھوٹ میں حکم چڑھایا اور نذر دلائی۔ بادشاہ نے دہلی میں اپنی شہریت کا اعلان کیا۔ اس جدلی مسلک پر حکیم حسن اللہ خاں (دوبیہ اعظم) اور لوگوں نے بادشاہ کو سختہ کیا کہ وہ قصبے میں بادشاہ کا نام خارج کریں گے۔ اس موقع پر بادشاہ کے حکم سے غالب نے (بے نام مثنوی) اور مولوی سہبائی نے ”دعائے الہا“ کہیں۔ دونوں مثنویوں میں بادشاہ، شہزادہ حیدر شاہ اور میر دوست علی خاں (شاگرد آتش) کے چان کی تردید کی گئی۔ سہبائی نے مثنوی صاحب پر الزام لگایا تھا کہ علم کے قصبے کے بچے بھی کا نام تھا اس لیے مثنوی میں مثنوی صاحب کی جگہ کی گئی۔ ”خطاب قاضی“ مثنوی ”دعائے الہا“ کی رد میں لکھی گئی تھی۔

دیوانِ غالب: نسخہ حمیدیہ (بعض اہم انکشافات)

(غالب اسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے زیرِ اہتمام غالب سیمینار دسمبر ۱۹۸۸ء میں دیوانِ غالب میں منعقد ہوا تھا۔ یہ مقالہ ایک بڑے اجتماع میں ماہرینِ غالبیات جناب مالک رام، آل احمد سرور، گوپتی چند نارنگ، قمر دیکس، ظلیق انجم وغیرہم کی موجودگی میں پڑھا گیا۔ اکبر حمیدی)

نسخہ حمیدیہ کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا تھا۔ سرورق پر غالب کی اس تصویر کا ٹکس ہے جو نسخہ نقاشی ہدایونی میں ۱۹۱۵ء میں چھپا تھا۔ اس صفحے میں یہ بھی درج ہے:

دیوانِ غالب جدید (المعروف بہ نسخہ حمیدیہ) مرزا اسد اللہ خاں
غالب مرتبہ: مفتی محمد انوار الحق۔

کتاب کا سائز ۸/۲۰x۳۶ ہے۔ صفحہ نمبر ۱ پر نواب حمید اللہ خاں کا ”سرباز“

یوں درج ہے:

اوائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

میں دلی سرت سے میرزا غالب کے دیوان اردو کا یہ جدید نسخہ
 اپنے ملک کے سامنے پیش کرتا ہوں اور مجھے اپنی سعادت پر فخر
 ہے کہ اس شہنشاہِ عالمِ سنخوری کے عہدِ شباب کی تازگی خیالی اور
 کلتہ نخی کے یہ نقشِ ازل، جو سو برس سے کج شمول اور گوشہ
 زہول میں چڑے تھے، آج میرے ذریعے سے ملک میں رونما اور
 جلوہ بکرا ہوتے ہیں۔ اردو، جو بلا اختلاف ملت ہم سب کی
 مشترکہ زبان ہے اور جس پر ہماری ترقیوں کا انحصار ہے، اپنے
 مجموعہ ادب میں اس بے بہا اضافے پر جتنا تاز کرے بجا ہے اور
 اربابِ فہم و عارف جو بلا امتیاز قوم و وطن اس خلاق معانی کی لہر
 سرائی اور مضمون آفرینی کے دل دادہ ہیں، اس کی جس قدر قدر
 کریں، دیا ہے، کیوں کہ اس میں کلام نہیں کہ:

از تازگی بہ دہر تکرر نمی شود
 نغمے کہ ککلبِ غالبِ غوغایی رقم کند

اس کے بعد اہد کے ٹائٹل میں یہ عبارت ہے:

دیوان غالب جدید / المعروف بہ نسخہ حمید جامع مقدمہ دیوان / فخر
 قوم جناب ڈاکٹر عبدالرحمن مرحوم بی اے، ایل ایل بی، ایڈیٹر
 ایٹ لا، ڈی، سچا مرشد خاکسار ضیاء العلوم مفتی محمد انوار الحق
 ایم۔ اے، مٹھی فاضل / ڈائریکٹر تعلیمات، ریاست بھوپال...

اس وقت ہمارے پیش نظر دیوان غالب نسخہ حمید کا وہ آئینہ نسخہ ہے جسے

۱۹۸۲ء میں اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے شائع کیا تھا۔ اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر محمود
 اعلیٰ صاحب "پیش لفظ" میں لکھتے ہیں کہ:

قابلیات کا مطالعہ کرنے والوں کو دیوان غالب کے نسخہ حمید کی
 اہمیت کا علم ہے۔ دیوان غالب کا ایک خطی نسخہ مکتوبہ ۱۳۳۷ھ

(۱۸۳۱ء) سابق ریاست بھوپال کے سرکاری کتاب خانے میں محفوظ تھا۔ جس سے غالب کے غیر متداول کلام کی نکاساں ہوئی تھی۔ اس غلطی نسخے کو سامنے رکھ کر مفتی محمد انوارالحق نے ”دیوان غالب جدید المعروف بہ نسخہ حمید“ مرتب کیا جس کی اشاعت ۱۹۲۱ء میں عمل میں آئی۔۔۔ ہر چند نسخہ حمید یہ اغلاط سے معصوم ہے۔ لیکن ایسی صورت میں جب کہ اصلی غلطی نسخہ مقتور واکھر ہے۔ اسی پر انکشاف کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔

صفحہ ۳ سے ص ۲۴ تک مفتی محمد انوارالحق کا مضمون ”تہمید“ کے عنوان سے درج ہے۔ اس کے بعد ص ۲۵ سے ۱۳۹ تک ڈاکٹر عبدالرحمن بکنوری مرحوم کا وہ معرکہ آرا مقدمہ شامل کیا گیا ہے جو انھوں نے متداول دیوان غالب کے لیے اپنی وفات دسمبر ۱۹۱۸ء سے نقل لکھا تھا۔ جو مقدمہ ایک صفحہ بالکل خالی چھوڑا گیا ہے۔ اس کے بعد نئے سرے سے صفحوں کے نمبر ڈالے گئے ہیں۔ صفحہ ایک سے ۲۴۲ تک متن شامل کیا گیا ہے۔ ابتدا میں غزلیں ہیں، آخری غزل صفحہ ۲۸۸ پر ختم ہوتی ہے۔ اس میں آٹھ شعر ہیں۔ ذیل میں مطلع اور مطلع درج کیے جاتے ہیں:

میں ہوں مشتاقی جہاں مجھ پہ جہاں اور کسی
تم ہو بیداو سے غرض، اس سے سوا اور کسی
مجھ سے غالب یہ علاقے نے غزل کھسوائی
ایک بیداوگر رنج فزا اور کسی

حاشیے میں یہ مہارت درج ہے:

یہ غزل غالب نے اپنے ایک خط میں لکھی ہے جو ”اردوئے معلّے“

اور دیوان غالب مطبوعہ بدایوں کے آخر میں موجود ہے۔

ذیل میں پہلی غزل درج کی جاتی ہے۔ پانچ شعر ایسی ہیں جو خارج کردہ

کئے۔ مقابلے کے لیے مطبوعہ دیوان دیکھا جاسکتا ہے۔ غزل میں پہلے اسد مخمس تھا۔

بعد میں غالب ڈالا گیا:

نکلن، فریادی ہے کس کی شوقی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر ٹیکہ قصور کا
آتشیں پا ہوں، گداز و شب زخماں نہ پوچھ
سوے آتش دیدہ ہے حلقہ بری زنجیر کا
شوقی نیرنگ صدف و شب طاؤس ہے
دام سبزے میں ہے پرداز چمن تسخیر کا
لذت انجوار ناز، اسون عرض ذوقِ قل
نعل آتش میں ہے تنج بار سے تنجیر کا
کاہ کار خست جانیہائے تھائی نہ پوچھ
مچ کرنا شام کا لانا ہے مجھے شیر کا
شب بخت دست بجز و غالب، آغوشِ دواں
بہ ہوا ہے بل سے پکانہ کس تعمیر کا
شب خواب عدم شور تماشا ہے اسد
سینہ شمشیر سے ہار ہے دم شمشیر کا
آگہی دام شتین جس قدر چاہے بچائے
دعا حلقا ہے اپنے عالمِ تحریر کا
بلکہ ہوں غالب امیری میں بھی آتش زہر کا
سوے آتش دیدہ ہے حلقہ بری زنجیر کا

صفحہ ۲۸۹ سے صفحہ ۲۹۰ تک قصائد ہیں۔ ان میں ”ورصفیہ انہ“ کی مثنوی

بھی شامل ہے۔ پہلے قصیدے کا مطلع یہ ہے:

بحر ترویج جنابِ دہلی ہم الحساب
ضامنِ تمجیدِ قمرستانِ دہلئے خراب

قصیدے کی ابتدا میں ”فاتحہ فارسی“ جلی حروف میں لکھا ہوا ہے اور حاشیے کی عبارت یہ ہے:

یہ فاتحہ دیوان غالب فارسی مطبوعہ نوکلشور کے صفحہ ۳۷، ۳۸، ۳۹ پر
 بہ اختلاف خفیف درج ہے، لیکن چونکہ قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں
 حدود اشعار کی کمی و بیشی ہے، اس لیے یہاں قلمی نسخے کے اشعار
 کو پورا نقل کر دیا ہے اور جو شعر دو دیوانوں میں مشترک ہیں ان
 کو ”م“ سے ممتاز کر دیا ہے۔ بنوب طوالت مطبوعہ شعروں کے
 اختلاف دکھانے کی میں نے جرأت نہیں کی۔ ارباب ذوق مطبوعہ
 دیوانوں سے مقابلہ فرما سکتے ہیں۔

آخری قصیدہ ”در صلبِ انبہ“ ہے۔ اس میں ۳۳ شعر ہیں، پہلا اور آخری
 شعر درج کیے جاتے ہیں:

ہاں، دل دردِ منو زمرہ ساز کیوں نہ کھولے درِ خزینہ راز
 شاد و دل شاد و شادیاں رکھو اور غالب پہ مہرباں رکھو
 صفحہ ۳۲ سے ۳۳ تک چھوٹے بڑے قطعات ہیں۔ پہلے قلمی کی ابتدا ذیل
 کے شعر سے ہوتی ہے:

اے شہنشاہِ فلکِ ماطر بے شکل و نظیر
 اے جہاندارِ کرمِ شیعہ بے شبہ و عدیل
 آخری قلمی کے دو شعر یہ ہیں:

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں
 دربار دارِ لوگِ بجمِ آشنا ہیں
 کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام
 ہے اس سے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

پھر اسی صفحہ سے آخری صفحہ ۳۳ تک رہنمائیات ہیں۔ ان کی تعداد ۲۲ ہے۔

پہلی اور آخری رباعی پیش کی جاتی ہیں:

بعد از اتمام یزیم صید الخصال کلام جوانی رہے ساغر کش حال
آپچھے ہیں تاسواہ اقلیم عدم اے عمر گزشتہ یک قدم استقبال
ان ہم کے بچوں کو کوئی کیا جانے بھیجے ہیں جو ارمغانِ حیرت والا نے
کن کر دیوہیں گے ہم دعائیں سو بار فیروزے کی تسبیح کے ہیں یہ دانے
دیوان کے حاشی میں حذف و شعر درج ہیں۔ دوسری غزل کا دوسرا شعر متن
میں اس طرح ہے:

مہ اختر فشاں کی بھر استقبال آنکھوں سے
تراشا کشور آئینہ میں آئینہ بند آیا
حاشے میں اس شعر کے پہلے مصرع کے بارے میں یہ لکھا ہے:
پہلے یہ مصرع متن میں یوں تھا:
بہ استقبال تمثال زہد اختر فشاں شوشی
غزل کا مطلع یہ ہے:

جنوں گرم انگار و تالہ چٹائی کند آیا
سویدا تا بلب زنجیری سے دود پند آیا (۱۲) شعر
مصرع ثانی یوں صحیح ہے:

”سویدا تا بلب زنجیری دود پند آیا“

ص ۳ کے متن میں شعر یوں درج ہے:

سواہ چشم بیل انتخاب نقطہ آرائی غرام ناز ہے پرولنی قائل پند آیا
اس شعر پر ”لا، لا“ لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً اسے حذف
قرار دیا ہے اور اس کے بجائے حاشے پر یہ شعر بڑھایا گیا:

روانی ہائے موج غول بیل سے نکلتا ہے کہ لعل بے تماشا رہنی قائل پند آیا
نسخہ حمید کا متن یہ از الغلط ہے، ذیل میں چند غلطیوں کی نشان دہی کی

جاتی ہے:

مس ۵ غزل:

عشق سے طبیعت نے زینت کا حرا پایا
غزل کا ایک شعر یوں ہے:

شب نگارہ پرور تھا خواب میں خیال اس کا
صبح، مسجہ کل کو وقف ہو گیا پایا
پہلے مصرع میں خیال کے بدلے ”خرام“ درست ہے:
مس ۶ غزل:

شوق، ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا
مصرع پہلے اس طرح تھا:

عشرت ایجاد چہ بوسے گل و گو دوو چراغ
غزل کا مطلع پہلے یوں تھا:

کارخانے سے جنوں کے بھی میں مریاں نکلا
میری قسمت کا نہ ایک آدمہ گریباں نکلا
شعر:

خود رسولی دل دیکھ کر یک نالہ دل
لاکھ پردے میں چھپا پھر وہی مریاں نکلا
مصرع جاتی یوں درست ہے: لاکھ پردے میں چھپا پر وہی مریاں نکلا
مس ۱۱ شعر:

نہ ہو وحشت کش درہی سراپ سطر آگہی
میں گرد راہ ہوں بے مدعا ہے بیج و غم میرا
مصرع جاتی یوں ہونا چاہیے:

غبار راہ ہوں بے مدعا ہے بیج و غم میرا

مقطع:

اسدِ وحشت پر سب گوشے تہائی دل ہے
برنگِ موج نے، خمیازہ ساغر ہے دم میرا
مصرعِ اذیل میں ”ہے“ کے بجائے ”ہوں“ صحیح ہے۔
س ۱۲ مصرع:

تھائل کو نہ کر مصروفِ تمکین آزمائی کا
یہاں ”مصروف“ کے بدلے ”مغرول“ صحیح ہے۔ اسی طرح ذیل کا
مصرع دیکھیے:

نظر بازیِ طلسمِ وحشت آباد پریشاں ہے
صحیح مصرع یہ ہے:

نظر بازیِ طلسمِ وحشت آباد پریشاں ہے
س ۱۳ شعر:

غریبِ بدرِ جنتِ بازگشتِ خنِ ہوں، خنِ بر لبِ آردگاں کا
مصرعِ اذیل میں درست ہے:
غریبِ ستم دیدہ بازگشت
مصرع:

داں کرم کو عذرِ بارش تھا عنا کیو خرام
یہاں ”عنا“ کی بجائے ”عناں“ ہونا چاہیے۔ یہ مصرع بھی ملاحظہ ہو:
شوخیِ بارش سے مرِ خوارۂ سیلاب تھا
یہاں ”خوارۂ سیلاب“ ہونا چاہیے۔ غزل کا مقطع یہ ہے:
داں بھومِ نغمہ ہائے سازِ عشرت تھا اسد
ناغمیِ غمِ پاں سرِ تارِ نفسِ معراب تھا

غزل کا مطلع :

شب کہ ذوقِ گفتگو سے حیر، دل بے تاب تھا
شوخیِ وحشت سے افسانہٴ فسونِ خواب تھا
حاجے میں مطلع کے بارے میں لکھا ہے کہ:

اس غزل کا مطلع اور مقطع دونوں دیوانِ غالب شائع کردہ مولانا
حسرت موہانی اور دیوانِ غالب مطبوعہ مطبعِ نظامی بدایونی کے آخر
میں غیر مرقعہ اشعار کے ضمن میں درج ہیں۔

صفحہ ۳۸ میں پانچ شعر کی ایک غزل ہے، مطلع اس طرح ہے:

دردِ امِ حق سے دیدارِ ضم حاصل ہوا
رشتہٴ تسبیحِ تارِ چادہٴ منزل ہوا

پہلا ہی لفظ ”درد“ غلط ہے، دراصل یہ ”درد“ ہے۔

دیوانِ غالب نسخہ حمید یہ غالب کے قلمی دیوان نسخہ بھوپال کا جدید ایڈیشن

ہے۔ مفتی انوار الحق نسخہ بھوپال کے بارے میں لکھتے ہیں:

اس نامور کتاب کو محفوظ رکھنے کا شرف کتب خانہ حمید یہ بھوپال کو
حاصل ہے۔ یہ تحقیقی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ یہ دیوان یہاں
کیوں کر پہنچا، لیکن تاریخِ کتابت اور مہرود وغیرہ سے اتنا پتا چلتا
ہے کہ یہ غالب رئیس وقت نواب غوث محمد خاں صاحب کے بیٹے
میاں فوجدار خاں صاحب کے لیے لکھا گیا تھا، چنانچہ اس کے
شروع میں ایک سطرے پر یہ لکھا ہوا ہے:

”دیوانِ بڈا من تصنیف مرزا نوشہ دیلوی، المتخلص بہ اسد از کتب

خانہ سرکار فیض آباد عالم پناہ میاں فوجدار محمد خان بہادر دام اقبال
قلمی خوشنویس۔“

جاتے پر ذیل کا ترجمہ ہے:

”دیوان من تصنیف مرزا صاحب و قبلہ المخلص بہ اسد و غالب
سلمہ ربیم علی من الخیرات الخویہ صورت اتمام یافت۔“

بعض لوگ کہتے ہیں کہ نسخہ جدید کے حواشی میں جو اشعار ہیں یا جن اشعار کو
غالب نے قلم زد کیا ہے، وہ غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ لیکن مرثی صاحب ان
لوگوں کی آرا سے متفق نہیں ہیں۔

مرزا غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد ہی لوگوں کو ان
کا کلام دریافت کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ انھوں نے اس بات کی تحقیق نہیں کی کہ یہ
کلام واقعی مرزا کا ہے۔ تذکروں سے ثابت ہے کہ مرزا غالب سے پہلے اور ان کے
زمانے میں کئی لوگ اسد اور غالب کے تخلص سے لکھتے تھے۔ ہماری رائے میں ان
لوگوں کا کلام مرزا اسد اللہ خاں غالب کے نام سے غالباً پہلی مرتبہ ”مجمع الاشعار“
مطبوعہ مطبع ذوالفقار لکھنؤ میں ۱۸۷۲ء میں چھپنا شروع ہوا۔ ہمارے پاس اپریل ۱۸۷۷ء
کا تیسرا ایڈیشن ہے۔ اس کے صفحہ ۴۳ اور ص ۸۳ میں ”غزل غالب“ کے عنوان سے دو
غزلیں چھپی ہیں۔ پہلی غزل میں ۷ اور دوسری میں ۶ شعر ہیں۔ دونوں غزلوں کے
مقطع درج کیے جاتے ہیں۔

(۱) آگے اپنے یار کے غالب ہمیں معیوب ہیں

درد ہے اس کو اسی صیب و ہجر کا امتیاز

(۲) لیکن کر ہووے گا خوش حال دو شاد کوئی

ہم بھی ہیں شاد اے غالب اسی عریانی میں

پہلی غزل دیوان چھاں جی میں مکرم الدولہ بہادر بیگ خاں تخلص غالب کے
نام منسوب ہے۔ ”عمدۂ تنقید“ (سال کتابت ۱۲۲۲ھ) میں اس غالب کا سال انتقال
۱۲۱۸ھ دیکھایا گیا ہے۔ ”معتنٰی بے نظیر“ میں بھی یہ غزلیں غالب کے نام سے شامل
ہیں۔ یہ غزلیں بعض لوگوں نے اسد اللہ خاں غالب مرزا نوشہ سے منسوب کر کے غلطی

کی ہے۔

”مخزن“ لاہور کے ابدائی پڑھوں میں بھی غالب کے نام سے دوسروں کا کلام چھپنے لگا۔ یہ سلسلہ ”الہلال“ کلکتہ میں جاری رہا۔ ۱۹۱۹ء میں غالب کے انتقال کے پورے پچاس سال کے بعد دیوان غالب نسخہ بھوپال نمودار کیا گیا اور اس پر ۱۳۳۷ ہجری (۱۸۲۱ء) کا ترقیہ دکھایا گیا۔ کس نے لکھا، کہاں لکھا گیا اور بھوپال کیسے پہنچا؟ آج تک تھکے تحقیق ہے۔ ترقیے کے پورے ایک سو سال کے بعد ۱۹۲۱ء میں شائع کیا گیا۔ اشاعت سے پہلے ڈاکٹر عبدالحق ”اردو“۔ ماہی، انجمن ترقی اردو ہند، کے شمارے باہت جنوری ۱۹۲۱ء (صفحہ ۹) میں لکھتے ہیں:

انجمن ترقی اردو کا ایک مدت سے ارادہ تھا کہ مرزا غالب کے اردو دیوان کا ایک نئیں صحیح، جدید ایڈیشن طبع کرے۔ چنانچہ بڑی کوشش اور محنت سے یہ دیوان مرتب کیا گیا۔ میری درخواست پر ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم نے اس کے لیے بطور مقدمہ غالب کے کلام پر تہہ لکھنا شروع کیا۔ اسی اثنا میں اتفاق سے بھوپال کے سرکاری کتب خانے میں مرزا صاحب کے قدیم دیوان کا مکمل نسخہ نکل آیا، جس میں وہ تمام نظمیں درج تھیں جو بعد میں خارج کردی گئی تھیں۔ علمی لحاظ سے یہ ایک بڑی نعمت اور بیش بہا خزانہ تھا۔ مرحوم نے انجمن کے لیے اسے ترمیم دینا شروع کیا۔ لیکن انیسویں، اہل نے اچھی مہلت نہ دی کہ اس کی تکمیل ہو جاتی اور یہ ہونہار نوجوان، جو علم و اخلاق کا پتلا تھا بے وقت اس دنیا سے کوچ کر گیا۔

نسخہ جدید کے پورے دس سال کے بعد مولوی عبدالباری آسی مرحوم کے یہاں ایک اور ”بیاض“ کا ظہور ہوا، جس میں مرزا غالب کا غیر مطبوعہ کلام وافر تعداد میں دکھایا گیا۔ اردو کے مشہور ناقد جناب نیاز فتح پوری صاحب نے اپنے مشہور ماہ نامے

”گاز“ لکھو۔ بابت فروری ۱۹۳۱ء شمارہ ۴، (صفحہ ۶۱ تا ۶۶) میں ”نواور ادب: غالب کا غیر مطبوعہ کلام“ کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا۔ اس میں آئی صاحب کے اختراع کردہ غالب کے غیر مطبوعہ کلام کو زمرہ طبع سے آراستہ کیا۔ انتخاب میں ۹ غزلوں کے ۷۶ شعر درج کیے۔ نواز صاحب نے غالب کے ان نام نہاد فرضی اور جعلی اشعار کو قطعیت اور یقین محکم کے ساتھ کلامِ غالب قرار دیا، فرماتے ہیں:

اس وقت غالب کے اردو کلام کے دو مجموعے ملک میں نظر آتے ہیں۔ ایک وہ عام اور حداقل نسیم حیدر کے حلق کہا جاتا ہے کہ مولانا فضل حق خیر آبادی کے مشورے سے غالب نے مرثیہ کیا تھا اور جس میں سے زیادہ غزل اور دہرا اشعار نکال دیے تھے۔ دوسرا وہ جو نسیم حیدر کے نام سے معروف ہے، اور جس کو ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے کتب خانہ بھوپال کے ایک قدیم نسخے کے موافق مرثیہ کیا اور انجمن ترقی اردو نے شائع کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نسخے میں تمام وہ اشعار موجود ہیں جن کے حذف کرنے کے لیے بعد حداقل نسیم حیدر مرثیہ کیا گیا تھا۔ اس لیے خیال کیا جاتا تھا کہ اب کوئی حصہ کلامِ غالب کا ایسا نہیں ہے۔ جو شائع ہونے سے رہ گیا ہو۔ لیکن حال ہی میں ایک گہمی بیاض صدیق بک ڈپو کو دستیاب ہوئی ہے جس میں حصہ دہ غزلیں غالب کی ایسی درج ہیں جو نہ حداقل نسخے میں پائی جاتی ہیں نہ نسیم حیدر میں۔ اب یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ غزلیں واقعی غالب کی ہیں یا نہیں اور دوسرا یہ کہ اگر غالب ہی کی ہیں تو اس نسخے میں کیوں نہیں پائی جاتی ہیں جو بھوپال بھبا کیا تھا۔ سر اول کے حلقہ گفتگو فضول ہے، کیوں کہ غالب کا رنگ سخن ایسا نہیں جو چھپا رہے اور جس پر دو رائیں قائم

ہو سکیں۔ وہ گیا ہر ٹائی، سو یہ ہو سکتا ہے کہ بھوپال والے نسخے کی ترسیب کے بعد غالب نے اور غزلیں کہی ہوں اور ان میں سے بعض کسی نے اس بیاض میں نقل کر لی ہوں یا پھر یہ وہ غزلیں ہیں جو مختلف اوقات میں غالب نے بغیر مسودہ رکھے ہوئے کسی کو سنائی ہوں اور اس نے محفوظ کر لیا ہو۔ بہر حال، بیاض زیر بحث میں جتنی غزلیں پائی جاتی ہیں وہ یقیناً غالب کی ہیں۔

ایک اور معروف نقاد جناب بھٹوں گورو کہ پوری اپنے رسالے ”ایمان“، بابت جنوری ۱۹۳۱ء میں لکھتے ہیں:

مہری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب کہ میں پچھلے بیٹھے لکھو گیا اور اپنے کرم دوست جناب مولانا عبدالہادی آسی کے پاس ایک قلمی بیاض جس میں علاوہ اور شعرا کے غالب کی بھی چند غزلیں ہیں۔ ان میں ایک یا دو ایسی ہیں جو نسخہ حمید ہے اور دیوانہ غالب متداولہ دونوں میں موجود ہیں۔ باقی سب غیر مطبوعہ ہیں۔ بیاض یقیناً اب سے چالیس پچاس سال پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ یہ غزلیں واقعی غالب کی ہیں یا نہیں، اس کا ثبوت یوں تو ایک یہ بھی ہے کہ ان میں ایک دو غزلیں غالب کی ہیں۔ وہی بندش الفاظ، وہی اختصار و بلاغت، وہی دلچسپ نظروں، وہی شاعرانہ جلال جس نے غالب کو غالب بنا دیا ہے۔ ان غزلوں کی امتیازی شان ہے۔ یہ غزلیں قطعاً غالب کے درمیانی دور کی ہیں، جب کہ ان میں توازن اور احتمال آپکا تھا اور جب کہ ان کے چمکنے میں دوسروں کو بھی حرا آنے کا تھا، یعنی جب کہ ان کی سنجیدہ مٹیالی اور مشکل بیانی میں سلاست اور قلمبازی رونما ہو چکی تھی۔

دراصل اس جہلی اور فرضی ”غالب کا غیر مطبوعہ کلام“ کے خالق آسی تھے۔

موصوف نے اس سے قبل غالب کا الحاقی کلام مرثیہ کر کے دیوان غالب (اردو) کا ایک نیا ایڈیشن ۱۹۲۵ء میں شائع کیا۔ اس کے بعد ایک ضخیم کتاب ”مکمل شرح دیوان غالب“ مرثیہ کی۔ اس میں اپنا کلام غالب کے نام سے شامل کیا۔ کتاب ”مکمل شرح غالب اور غالب کا غیر مطلوبہ کلام“ کے نام سے ۱۹۳۱ء میں صدیقی بک ڈپو سے شائع ہوئی۔ اس میں غالب کی جو تصویر چھپی ہے وہ بھی جعلی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ جناب امتیاز علی خاں عرشی نے بھی دیوان غالب نسخہ عرشی مطلوبہ ۱۹۸۷ء (انجمن ترقی اردو، ہند) میں آتشی کے مرثیہ کردہ ان جعلی اشعار کو شامل کیا۔

مرزا غالب کی وفات کے پورے ایک سو سال بعد ”بیاض غالب“ کا ایک اور قلمی نسخہ معرض وجود میں لایا گیا۔ فروری ۱۹۶۹ء میں حسن صدیقی غالب سرکاری طور پر ملک کے طول و عرض میں منایا گیا۔ بیاض غالب، جسے نسخہ توفیق بھی کہا جاتا تھا، جناب اکبر علی خاں عرشی زاوہ نے ہندوستان میں شائع کیا تھا۔ اس کی نقل لاہور پہنچائی گئی اور ”نقوش“ کے ایڈیٹر جناب محمد ظہیر نے اسے بڑے اہتمام سے ”غالب نمبر“ کے نام سے شائع کیا۔ مرثیوں کا دہرای تھا کہ اس میں غالب کا وہ کلام شامل ہے جو انھوں نے ۱۹ سال کی عمر میں ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۶ء) میں ترتیب دیا تھا۔ بزمگیر کے ماہرین غالبیات جناب امتیاز علی عرشی، پروفیسر آل محمد سرور، مالک رام، عرشی زاوہ، غلام رسول مہر اور ڈاکٹر گیان چند وغیرہ نے اس کے مستحق ہونے کی توثیق بھی فرمائی تھی۔ ہماری زبان نئی دہلی اور دوسرے رسائل میں اس کی مخالفت اور حمایت میں حصہ و مضامین شائع ہوئے۔ یہ مضامین ”نقوش“ لاہور غالب نمبر کے تیسرے صفحے میں موجود ہیں۔ بیاض غالب نسخہ لاہور ڈاکٹر ثار احمد قادری کے مقدمے کے ساتھ پہلے شائع ہوا تھا۔ اس میں میر لانی شخص اسد کی ایک غزل ”دم چند، غم چند“ بھی شامل کی گئی، جب کہ یہ غزل غالب کی حیات میں تذکرہ غریبگی میں میر لانی اسد کے نام سے چھپ چکی تھی۔ اس زمانے میں کمال احمد صدیقی نے ”بیاض غالب“ عرشی کی رو میں ایک ضخیم کتاب ۱۹۷۷ء سے تھانوں سے ”بیاض غالب“ کا ایک تختی

جائزہ کے نام سے شائع کیا۔ اس میں موصوف نے نسیم عرشی زادہ کو جہلی قرار دیا۔ کتاب کی قیمت پانچ سو روپے رکھی تھی۔ کمال صاحب کا کمال دیکھیے کہ انہوں نے غالب کے رنگ میں ایک غزل اختراع کی اور اسے دلی کے کسی کاتب سے خط غالب لکھوا کر اس کا فوٹو اتر دیا۔ جب یہ فوٹو راقم نے کسی مصلحت کے تحت ہروفیسر آل احمد سرور اور جناب مالک رام کو دکھایا تو انہوں نے اسے کلام غالب خط غالب تسلیم کر لیا۔ یہ غزل کمال صاحب نے کتاب کے آخر میں شامل کی۔ تصویر کے نیچے صفحہ ۴۸ میں کمال کا یہ جملہ لکھا ہوا موجود ہے:

”غزل کمال احمد صدیقی خط اسد اللہ خاں غالب“

یہ بات قاطبی ذکر ہے کہ بھوپال کے سرکاری کتب خانے میں دیوان غالب نسیم بھوپال عرصہ دراز سے غائب کیا گیا ہے۔ اس میں محمد تنجید اور محمد کرم دکا کے وہ اشعار غائب ہیں جو تیسرے غالب میں درج ہیں۔ نسیم عرشی زادہ کے بارے میں اکبر علی خاں اور توفیق احمد چشتی امردہوی کے درمیان بھوپال کی عدالت میں مقدمہ بھی چل رہا تھا اور دوران مقدمہ یہ نسیم بھی غائب کر دیا گیا۔ تفسیلات ”نقوش“ لاہور غالب نمبر کے تیسرے صفحے میں موجود ہیں۔ راقم الحروف کو دیوان غالب نسیم حیدر اور نسیم عرشی زادہ یا نسیم غالب (لاہور) کے خط غالب ہونے میں اختلاف ہے۔ دونوں نسخوں میں جو اشعار غالب سے منسوب کیے گئے ہیں وہ بھی مشکوک ہیں۔ نسیم حیدر بھی غالب نیاز اور آسی کی کارستانی کا نتیجہ ہے۔ نیاز اس زمانے میں بھوپال ہی میں مقیم تھے۔ قصہ کوتاہ جب تک یہ دونوں نسخے (حیدر اور عرشی زادہ) اصل حالت میں باز برآمد نہیں کیے جاتے اور تحقیق کی کسوٹی پر نہیں پرکھائے جاتے اس وقت تک راقم حروف ان کو غیر مستحضر قرار دیتا رہے گا۔ ان دونوں نسخوں میں غالب کے تخلص سے حصہ غزلیں ملتی ہیں۔ جب کہ مولوی محمد حسین آزاد ”آب حیات“ (ص ۵۰۰) میں لکھتے ہیں کہ غالب نے ۱۳۳۵ھ (۱۹۱۸ء) میں اسد اللہ کی رعایت سے غالب تخلص اختیار کیا۔ یہ سچ ہے

کہ غالب نے اپنے دیوان کا انتخاب کیا تھا، اس کا ذکر ایک خط میں یوں کرتے ہیں:
چندہ برس کی عمر سے تجویس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا
گیا۔ وہ برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب قیڑ آگئی تو
اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کیے۔ وہ چندہ شعر
واسطے نمونے کے دیوانی حال میں رہنے دیے۔

اس خط سے واضح ہوتا ہے کہ غالب نے اس قلمی دیوان کو پھاڑ کے پھینکا
تھا۔ وہ اپنے کلام کو صاف و پاک رکھنے کے فکر مند رہتے تھے۔ کسی نے ان کے سامنے
میر انانی اسد کا مقلع پڑھا تو انھوں نے کہا، ”اگر یہ مقلع میرا ہو تو مجھ پر ہزار لعنت۔“
ایک خط میں مرزا شہاب الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں کہ:

واسطے خدا کے، یہ تم نے اور حکیم غلام نجف خاں نے میرے
دیوان کا کیا حال کر دیا ہے۔ یہ اشعار جو تم نے بیچے ہیں، خدا
جانے کس ولد ابرتا نے داخل کر دیے ہیں۔ دیوان تو چھاپے کا
ہے، متن میں اگر یہ شعر ہوں تو میرے ہیں اور اگر جاڑے پر ہوں
تو میرے نہیں ہیں۔ بالفرض اگر یہ شعر متن میں پائے بھی جاویں
تو یوں سمجھنا کہ کسی طعون زن جلب نے اصل کلام کو پھیل کر یہ
خراقات لکھ دیے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس مقصد کے یہ شعر ہیں اس
کے باپ پر اور دادا اور پردادا پر لعنت اور وہ ہفتاد و ہشت تک
ولد الخروم۔ اس کے سوا اور کیا لکھوں؟

مضمون کے اختتام پر اس واقعے کا ذکر کرنا مناسب ہے کہ کمال احمد صدیقی
جشن صد سالہ غالب منعقد ۱۹۶۹ء کے دوران ریڈیو کشمیر سری نگر سے وابستہ تھے۔ خواجہ
غلام محمد صادق وزیر اعلیٰ غالب کبلی کے صدر اور کمال صاحب بیکر بٹری تھے۔ انہی دنوں
خواجہ صاحب کا انتقال ہوا اور کمال صاحب غالب کبلی کے مالک ہو گئے۔ انھوں نے
مجھ سے غالب پر پانچ سو روپے کے عوض ایک کتاب اس شرط پر لکھوائی کہ کتاب
اشاعت پزیر ہوگی۔ عرصہ گزر جانے کے بعد کمال صاحب نے مجھے ۲۴ اپریل ۱۹۹۶ء

کو مطلع کیا کہ:

آپ کو یاد ہوگا کہ سری نگر میں غالب پر اپنے مضامین کا مجموعہ
آپ نے دیا تھا۔ میرے پاس محفوظ ہے۔ غالب انشٹی ٹیوٹ
(جس کے ساتھ کمال صاحب وابستہ تھے) اسے شائع کرے، تو
اس پر آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔

میں نے کتاب کی اشاعت کے لیے اپنی رضامندی سے آگاہ کیا۔ جون
۱۹۹۸ء میں کمال صاحب سے میری ملاقات سری نگر میں ہوئی۔ کتاب کے بارے میں
انہوں نے فرمایا کہ ”مسودہ چوری ہو گیا ہے۔“

میں نے یہ کتاب بڑی عرق ریزی سے لکھی تھی۔ اس کے تلف ہونے پر جو
صدمہ مجھے ہوا وہ ناقابل بیان ہے۔ بجز اس کے اور کیا کہا جائے:
”آں دفتر را گاہ نور، گاہ را قضا، بدو قضا بدو راہ نرو۔“



مضمون کی تیاری کے لیے درج ذیل کتابوں اور رسالوں سے استفادہ کیا گیا:

- (۱) ”آپ حیات“، مولوی محمد حسین آزاد
- (۲) ”سہ ماہی“، ”امروز“، پابند، دہلی، ۱۹۳۳ء
- (۳) ”سہ ماہی“، ”امروز“، پابند، دہلی، ۱۹۳۵ء
- (۴) ”اردو کے نئے نئے“، مطلع، کھپائی، دہلی، ۱۹۹۹ء
- (۵) ”آکرنا“، گلشن، بھارت، نئی دہلی
- (۶) ”دیوانی غالب نسخہ سیدہ“، ۱۹۵۸ء
- (۷) ”دیوانی غالب نسخہ سیدہ“، ۱۹۵۸ء
- (۸) ”جانشین غالب علیہ“، غالب تحفہ، جامعہ، کمال احمد علی
- (۹) ”دیوانی غالب نسخہ سیدہ“ (مطبوعہ اردو اکادمی، لکھنؤ)
- (۱۰) ”شرح دیوانی غالب“، مرتبہ آسی
- (۱۱) ”تاریخ اشعار“، مطلع، لکھنؤ، ۱۸۷۲ء
- (۱۲) ”تحریر“، لاہور، غالب نمبر، ۳
- (۱۳) ”گلزار“، لکھنؤ، پابند، دہلی، ۱۹۳۶ء

مخطوطہ دیوانِ غالب (نسخہ سری نگر) اور مطبوعہ نسخے بحیاتِ غالب

کشمیر یونیورسٹی اقبال لائبریری میں دیوانِ غالب کا ایک نادر الوجود قلمی نسخہ میری نظر سے گزرا۔ اگرچہ اس میں کہیں سالِ کتابت درج نہیں تاہم داخلی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ڈیڑھ سو سال سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ کافیہ دیز کشمیری ہے جو جابجا نثر و سجع کی جگہوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ مخطوطہ مشہور تاجر کتب توفیق احمد قادری مالک پینٹل بک ڈپو امرتسر ضلع مراد آباد کے پاس (جنہوں نے ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر متنازع فیہ دیوانِ غالب خطِ مصنف مکتوبہ ۱۳۳۱ ہجری بمطابق ۱۸۱۶ء پیش کیا تھا) موجود تھا۔ موصوف نے مخطوطے کی ابتدا میں پندرہ تقریریں درج کی ہیں۔ جن کے اقتباس انہی کے الفاظ میں پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) یہ دیوانِ دہلی میں لکھا گیا ہے۔ ۲۳ جبکہ استاد مخلص لکھا ہے۔ اس کی کوئی غزل غیر مطبوعہ نہیں ہے۔ البتہ ترتیب میں فرق ضرور ہے۔ قلم بھی اچھا نہیں۔ محض قلم سے محروم ہے۔ صرف قدیم ہونے کے ناتے پر اہم ہے۔

مخطوط دیوان غالب (نہدہری گم) اور مطلوبہ خطے عبارت غالب

(۲) حسان الہند علامہ محمد حسن طوی کا کوردی مرحوم و معذور سابق وکیل مین پوری التوتلی ۱۳۲۳ء کے حقیقی پوتے جناب طاہر حسن طوی صاحب سے خریدے۔ اس کی مرمت میں نے خود کی۔ بڑی نرمی حالت میں اس کو خریدے۔ میں ۱۰ جنوری ۱۹۷۲ء کو لکھنؤ کے لیے چلا۔ ۱۱ کو لکھنؤ پہنچا، ۱۲ جنوری کو قصداً کا کوردی گیا۔ میں نے سنا تھا کہ اس قصبے کے مشہور شاعر جناب حسن کا کوردی گزرے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے گھر کچھ مخطوطات ملیں۔ حسن اتفاق سے یہ مخطوط مجھے ملا۔ جو میں نے مبلغ پندرہ روپے میں خریدے۔ ۱۳ جنوری ۱۹۷۲ء کو اس کی اطلاع ”ہماری زبان“ کو دے دی گئی۔ ”ہماری زبان“ میں اس کو خطِ غالب لکھ دیا۔ صرف اس وجہ سے کہ ایک (انصار اللہ) نگر صاحب اور چند اشخاص نے پچھلے تھے (عرشی زادہ) خطِ غالب کو خطِ غالب ہونے سے انکار کیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی نظر اس کو خطِ غالب تسلیم کر لے، حالانکہ میں اس کو خطِ غالب نہیں مانتا ہوں۔ (دست خط توفیق احمد چشتی۔ اس کے بعد انگریزی حروف میں مہر ثبت ہے) ۱۵

راجم حروف نے مخطوطے کا مطالعہ بخار نگر کیا۔ یہ ۳۳ اوراقی (۶۶ صفحات) پر مشتمل ہے۔ پورا دیوان نوجو کثرت اور آمیزی میں لکھا گیا جس کا پڑھنا انتہائی مشکل ہے۔ کاتب کا نام منظور ہے۔ اشعار کی تعداد ۱۰۶۷ ہے۔ ورق ۱ الف میں کسی نے چند نام یادداشت کے طور پر لکھے ہیں۔ جیسے ”محمد عبدالرشید عفی عنہ، محمد عبداللہ خاں قبلہ و کعب“ پہلا نام مکی مرتبہ لکھا گیا ہے۔

میں نے مخطوطے کا مقابلہ دیوان غالب نسخہ عرشی سے کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مخطوط دیوان غالب کے پہلے ایڈیشن مطلوبہ ۱۸۳۱ء سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ دیا ہے اور ترمیم اشعار میں قدرے اختلاف بھی ہے۔ اس میں صرف غالب کا دیباچہ ہے۔ اس سے میرے موقف کی تائید ہوتی ہے کہ مخطوط پہلے ایڈیشن سے قبل کا ہے۔ جناب کمال داس گپتا رشا، دیوان غالب نسخہ رضا پارسم ۱۹۹۵ء کے صفحہ ۸۶ میں نکالی بدایونی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

غالب نے اپنے اردو دیوان کے پہلے ایڈیشن کا دیباچہ ذی قصہ

مخطوط دیوان غالب (سلسلہ سری نگر) اور مطبوعہ نئے عبارت غالب

۱۲۳۸ ہجری (مطابق ۱۶ اپریل ۱۸۲۲ء) کو تمام کیا۔ تقریباً چھ سال بعد نواب ضیاء الدین احمد خاں نے ۱۲۵۲ ہجری (۱۸۳۹ء-۱۸۴۸ء) میں نکسی۔ دیوان اکتوبر ۱۸۴۱ء میں ...
پہنچا۔ ۲۵

اس حساب سے زیرِ نظر مخطوط تقریباً ۱۷۰ سال پرانا ہے۔ اس کی ابتدا میں دیباچہ غالب ہے۔ دیباچے کے بعد اور اشعار سے پہلے ”یا اسد اللہ الطالب“ لکھا ہے۔ اس کے بعد ورق ۲ پ پر غالب کی پہلی غزل ہیں درج ہے:

نقص فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا کاغذی ہے جبرین ہر مایک تصویر کا
کاغذ کا وخت جا بیا ہے تھائی نہ پوچھ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوے شیر کا
ہڈیہ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے سپہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگئی دام شہین جس قدر چاہے بجائے دعا عطا ہے اپنے عالمِ فقر کا
بلکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا

موسے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ غزل کا پہلا اور چوتھا شعر ”گلِ رحمت“ (اختیار کلام غالب، سال ترتیب ۱۸۴۸ء) مرشد مالک رام، ۱۹۷۰ء میں بھی موجود ہیں۔ ورق ۳ الف میں یہ غزل بھی ہے:

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروے کار۔ ۶ شعر

غزل کے تین شعر ۱۔ تھا خواب میں... ۲۔ لیتا ہوں، منکبِ غم... ۳۔ ڈھانچا کفن... ”گلِ رحمت“ میں درج ہیں۔ مخطوطے میں غالب کی مشہور غزل ہے۔ مطلع تا مطلع، یعنی ساتوں شعر، ”ہوتے تک“ کی مدیف میں ہیں:

آہ کو چاہیے اک عمر اڑتے تک کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک
غمِ ہستی کا آئندہ کس سے ہو جز مرگِ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک
مخطوطے کی قدامت کا ایک اور ثبوت یہ بھی ہے کہ اس میں غالب کی بعض

مخلوطہ دیوان غالب (نئی سری نگر) اور معلوم نئے حیات غالب

مشہور غزلیں نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کلام بعد میں تصنیف کیا گیا تھا۔ چند غزلوں کے مطلع یہ ہیں:

- ۱۔ بزم شہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھو یارب، یہ در گنجینہ کوہر کھلا
- ۲۔ دور سے باز آئے، پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں، ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا
- ۳۔ ملتی ہے غم سے یار سے نار انتخاب میں
کافر ہوں مگر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
- ۴۔ ہے بلکہ ہر اک اکن کے اشارے میں نکلاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
- ۵۔ لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تجا مجھے کیوں؟ اب رہو تجا کوئی دن اور
- ۶۔ سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پہاں ہو گئیں
- ۷۔ کچھ تھیں ہے، طم دل اس کو ستائے نہ بنے
کیا جتنے بات، جہاں بات بتائے نہ بنے
- ۸۔ نفس میں ہوں کر اچھا بھی نہ جائیں میرے شیون کو
برا ہوتا تھا کیا ہے، نوا سخاں گلشن کو
- ۹۔ بازچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
- ۱۰۔ کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زبان کیوں ہو

ہم نے مخلوطہ دیوان غالب (نئی سری نگر) کے دیباچہ غالب کا مقابلہ نسخہ

مخلوط دیوانی غالب (نسخہ سری نگر) اور مطبوعہ نئے عہدات غالب

آکرہ سے کیا۔ دونوں ایک جیسے ہیں اور کوئی اختلاف نہیں ہے۔ غالب نے غشی شیونائن کو دیوان کے نئے ایڈیشن کی اشاعت کے لیے ۱۸۵۵ء کا مخلوطہ رام پور بھیجا تھا۔ اس لیے دونوں نئے اخطاط سے پاک ہیں۔ ذیل میں نسخہ سری نگر سے دیا چاہے غالب درج کیا جاتا ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مشام شمیم آشیایاں را صلا و نہاد انجمن نشیناں را حژوہ کہ لختی از
 سامانِ مجرہ گردانی آلودہ و دامنِ از عودِ ہندی دستِ بجم دادہ
 است۔ نہ چوبہائی سنگِ ڈوپ خوردہ بہ ہمار تا طبعی فکستہ ہے
 انعام تراشیدہ بلکہ بہ حیرتِ کائناتِ بکا در ریز ریز کردہ بسوہانِ خراشیدہ۔
 ابدونِ نفسِ گداختگی شوقِ بہ جتوے آتشِ پاری است نہ آتشِ کہ
 در کھنکھائے ہند افسردہ و خاموش۔ و از کتبِ خاکسترِ بمرگِ خودی
 یہ پیشِ جنی، چہ بروے مسلم است از ناپاکی ہاتھوانِ مردہ نامار
 فکستن و از دیوانگی برشتہ صبحِ حرارِ کشتہ آویختن، ہر آئینہ بدل
 گداختنِ نیرزد و بزمِ افروختن را نکاید۔ رخِ آتشِ بہ ضعیف
 برافروزدندہ و آتشِ پرست را بیادِ افراہ ہم در آتشِ سو زندہ نیک
 میدانکہ چو ہندہ در ہوائے آں رخسندہ آذرِ فعلِ در آتشِ ست کہ
 چشمِ روشنی ہو شک از سنگِ بروں تافتہ و در ایوانِ لہرِ اسپ نشو و نا
 یافتہ۔ خس را فروغِ ست و لالہ را رنگ و تیغ را چشم و کدوہ را
 چراغ۔ بخندہ، یزدانِ دودنِ بخش بر افروز را سپامِ شرارے ازاں
 آتشِ تابِ ناکِ بخاکسترِ خویش یافتہ، بکا و کادِ سینہ شتافتہ ام و از
 نفسِ دمرِ براں نہاد۔ تو کہ در اندکِ مایہ روزگارِ ان آں مایہ فرام
 تواند آمد کہ مجرہ را قزِ روشنیِ چراغ و راتخِ عودِ را بالِ شامانی
 دماغِ تواند کشید۔ ہا تا نگارندہ ایں نامہ را آں دوسرست کہ پس

از انتخاب دیوان ریختہ بہ گرد آوردن سرمایہ دیوان غازی بہ خرد و
 باسقااضہ کمال این فریور فن میں دانوے خوشن نقشہ۔ امید کہ
 سخن سرمایان خنور ستائی پرانندہ ایساتے را کہ خارج ازیں اوراق
 پائند۔ از آثار تراوشی رگ کلکب این نامہ سیاہ نقشہ سند و چامہ
 گرد آور را در ستایش و کوشش آں اشعار مثنوی و مازوزہ نگارند۔
 یارب این بوسے هستی ناشنیدہ از نیستی بہ پیدائی نارسیدہ یعنی نقش
 بہ ضمیر آمدہ نقاش کہ بہ اسد اللہ خاں موسوم و بہ میرزا نوشہ
 معروف و بہ غالب مخلص است۔ چنانکہ اکبر آبادی مولد و دہلوی
 مسکن است۔ فرجام کار بخشی مدفن نیز باد۔

نصیری نگر سے قطیع نظر ہم نے راجا صاحب محمود آباد کے بے نظیر کتب
 خانے میں دیوان غالب کے کئی ایڈیشن دیکھے ہیں۔ ان میں پہلا ایڈیشن مطبع دہلی اور
 مطبع لوکلور کنگو کے کئی ابتدائی نسخے قابل ذکر ہیں۔ غالب نے ۱۸۳۳ء میں اپنا
 دیوان مع دیباچہ مرتب کیا۔ اس کے پانچ سال کے بعد ۱۲۵۳ ہجری (۱۸۳۸ء) میں
 اس پر نواب ضیاء الدین احمد خاں نے تقریباً کسی۔ پچترین سال کے بعد ۱۲۵۷ء
 مطابق اکتوبر ۱۸۴۱ء میں پہلی مرتبہ سید محمد خان بہادر کے مطبع دہلی میں مطبعہ طبع سے
 آراستہ ہوا۔ دوسرا ایڈیشن مئی ۱۸۴۷ء میں مطبع دارالسلام دہلی واقع محلہ حوض کاظمی سے
 چمپا۔ تیسرا ایڈیشن مطبع احمدی باہتمام امیر جان ۲۰ محرم الحرام ۱۲۸۷ ہجری مطابق
 جولائی ۱۸۶۱ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس نسخے سے اکثر و بیشتر ماہرین قابلیت نظر فیضی
 کا ذکر ہوئے ہیں۔ جب یہ ہے کہ ان لوگوں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہی نہیں۔
 پروفیسر گیان چند صاحب اپنے مضمون ”نصیری نگر (مطبوعہ جانی کے لیے کچھ معروضات)“
 مطبوعہ ”نقوش“ غالب نمبر، ستمبر ۱۸۷۷ء، بابت فروری ۱۹۶۹ء میں لکھتے ہیں:

۱۔ غالب نے مطبع احمدی ایڈیشن ۱۸۶۱ء مطبع سوم کی ایک کاپی کی اپنے ہاتھ سے تصحیح
 کی۔ یہ بیش بہا کاپی کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ اسے مسٹر حلیم

مخطوطہ دیوان غالب (نہم سری نمبر) اور مطبوعہ نئے حیات غالب

کرتا چاہیے۔

۲۔ ۱۸۶۲ء کا چوتھا ایڈیشن مطبوعہ دہلی کان پور، جو متعدد جہاں بالا کاپی مغزوت حیدرآباد سے چھاپا گیا۔

۳۔ کان پور ایڈیشن غالب کا تصحیح کردہ آخری متن ہے۔ مالک رام صاحب نے اپنے مرشد دیوان کی بنا اسی پر رکھی ہے۔ کان پور ایڈیشن میں قباحت یہ ہے کہ اس میں اطلاق طباعت ہیں، جن کی درستی کتب خانہ آصفیہ کی کاپی سے کی جاسکتی ہے۔

پروفیسر صاحب "نقوش" (۱۹۳) میں مزید دعویٰ کرتے ہیں کہ: احمدی ایڈیشن ۱۸۶۱ء کی غالب کے ہاتھ کی تصحیح کردہ کاپی ہے جو کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہے اور جس سے نکالی ایڈیشن تیار کیا گیا۔ مالک رام صاحب نے دیوان کی ترتیب میں اس سے کہیں کہیں استفادہ کیا ہے۔

میں پورے وثوق اور قناعت داری کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ پروفیسر صاحب نے مطبوعہ احمدی کا ایڈیشن دیکھا ہی نہیں۔ انھوں نے اس بارے میں جو انکشاف کیا ہے، درست نہیں۔ اس نسخے کی اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ غلط و کم باب ایڈیشن کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں مخطوطہ نمبر ۹۸۸ کے تحت محفوظ ہے۔ یہ مرکز مخطوطہ نہیں، بلکہ مطبوعہ نسخہ ہے۔ اندراج کے رجسٹر اور فہرست مطبوعہ میں بھی اسے مخطوطات کے تحت درج کیا گیا ہے اور کیفیت خانے میں "تصحیح شدہ غالب" لکھا گیا ہے۔ اصل میں یہ دیوان غالب کا تیسرا (مطبوعہ) ایڈیشن ہے۔ جو غالب کی حیات میں ۲۰ء محرم ۱۲۷۸ ہجری (مطابق آخر جولائی ۱۸۶۱ء) کو مطبوعہ احمدی دہلی میں اموجان کے اہتمام سے شائع ہوا تھا۔ سرمدی کی چوٹی پر باریک غم سے ذیل کی عبارت سیاہ روشنائی سے درج ہے:

از ملک بچہ میرزا خاکسار دژا بے مقدار ستہ حسن عرف بدھن

مطلوبہ دیوان غالب (مستدریٰ نگر) اور مطلوبہ نئے عبارت غالب

سوزنوں ابن سید علی رضا ابن سید مولوی احسان محمد صاحب
المختص بہ صفا مرحوم و مغفور بکراچی۔

اس کے بعد اور بھی کچھ الفاظ تھے جو قلم زد کیے گئے ہیں۔ سرورق صفحہ اول
پر ہے۔ اس پر تین طرف سے خوب صورت نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ اس کے بیچ
میں ملی حروف میں ”دیوان غالب“ لکھا گیا اور اس کے بعد مطبع کا نام اس طرح
ہے۔ ”در مطبع احمدی با اتمام اسوہان مطبعہ۔“ دیوان کی تفصیلات یہ ہیں:
سائز 11×7 انچ۔ متن 9×5 انچ، سطر ۲۵، کل صفحات ۸۸۔

صفحہ ۲-۱۰۱۲ سخی میٹر میں لوح کے بعد ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ پھر
دیباچہ غالب شروع ہوتا ہے جو ۱۵ سطروں میں صفحہ ۳ کی پہلی تین سطروں میں ختم ہو
جاتا ہے۔ اسی صفحے میں پہلی غزل ”مقتل، فریادی۔“ شروع ہوتی ہے۔ صفحہ ۷۰ میں
دیوان غزلیات ذیل کی غزل پر ختم ہوتا ہے:

نویں امن ہے بیدار دوست ہاں کے لیے رہی نہ طرد حتم کوئی آسماں کے لیے
پھر اسی صفحے میں بغیر عنوان کے قصائد ہیں، انہی میں ایک مثنوی بھی ہے۔

تفصیلات یہ ہیں:

- ص ۷۰ (۱) ساز یک ڈزد نہیں فیضی جن سے بے کار ۱۸ شعر
- ص ۷۱ (۲) دہر جز ہلوا بیکٹی مشوق نہیں ۲۳ شعر
- ص ۷۲ (۳) ہاں، مہر نوسین ہم اس کا نام ۵۸ شعر
- ص ۷۵ (۴) صبح دم دروازہ کا خاور کھلا ۲۳ شعر
- ص ۷۸ (۵) مطلع: ہاں، دلی درویش دھرم ساز

کیوں نہ کھولے درختہ راز ۳۳ شعر
مطلع: شاد و دل شاد و شاد ماں رکھو
اور غالب پہ مہیاں رکھو

نور عرش میں نمبر ۵ کا عنوان ”مثنوی“ ہے جب کہ دیوان غالب کے چوتھے

مطلوبہ دیوان غالب (نثری نثر) اور مطلوبہ نثری اشعار غالب

ایڈیشن مطبوعہ کھای کان پور ۱۸۶۲ء میں اس کا عنوان ”در صفت رنہ“ دیا گیا۔ پانچویں ایڈیشن نثری آگرہ مطبوعہ ۱۸۶۳ء میں بھی ”مشق“ ہی لکھا ہے۔ صفحہ ۷۸ میں مثنوی کے اختتام پر قلعہ شریع ہوتے ہیں۔ کسی قلعے کے اوپر کوئی عنوان نہیں موجود ہے۔ یہ سلسلہ ص ۸۳ تک ہے۔ چھوٹے بڑے قلعہ کی تعداد ۱۶ ہے۔ صفحہ ۸۱ میں ذیل کا قلعہ شعر کا ہے:

اے شاہ جہاں کیر جہاں بخش جہاں دار ہے غیب سے ہر دم مجھے صد گونہ بشارت دیوان کے سبھی مطبوعہ نسخوں میں (جو غالب کی زندگی میں چھپے ہیں) اس قلعے کا کوئی عنوان نہیں ہے۔ غالب کے شاگرد مثنوی شیونرائی آرام نے باعانت مثنوی محمد حکیم الدین دغنی سید غلام حسنین قدس سرہ بکراہی ”مجموعہ سخن“ حصہ دوم مطبوعہ لاہور ۱۸۷۳ء میں اس قلعے کا عنوان ”مدح شاہ تہذیب نوروز“ لکھا ہے۔ یہ پہلی مرتبہ نثری مطبوعہ احمدی میں چھپا تھا۔ صفحہ ۸۳ سے رباعیات شروع ہوتی ہیں۔ ان کی تعداد ۱۶ ہے۔ آخری رباعی کے دو مصرع صفحہ ۸۶ میں ختم ہوتے ہیں۔ پہلی اور آخری رباعی ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

(۱) بعد از اتمام بزم صید اطفال تمام جوانی رہے ساغر کش حال

آپہنچے ہیں تا سوار القیم عدم اے عمر گزشتہ یک قدم استقبال

(۲) ان سب کے بچوں کو کوئی کیا جانے بیچھے ہیں جو ارمغان خیر والے

گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

رباعیوں کے بعد صفحہ ۸۶ میں ”خاتمہ“ کے تحت نواب محمد ضیاء الدین خان

بہادر کی تقریب ہے۔ صفحہ ۸۸ کی تیسری سطر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی تقریب ہے جو

پہلے ایڈیشن میں شامل کی گئی تھی، یہاں صرف تاریخ ۱۲۷۱ ہجری والے نسخے کی تاریخ

ذاتی گئی۔ یہ نسخہ رام پور میں تھا۔ سطر ۶ میں اشعار کی تعداد ۱۶۹۵ ہے۔ یہ بات

کاظمی ذکر ہے کہ نسخہ رام پور میں عرشی صاحب کے مطابق آٹھ ہی اشعار تھے۔

مطلوبہ خط عبارت غالب (نثری نمبر) اور مطلوبہ خط عبارت غالب

نثر احمدی کا یہ جملہ ہے:

۱ ۶ ۹ ۵

”ہمکی اشعار غزلی شعار غزل و قصیدہ و قطعہ و رباعی ایک ہزار و شش صد و نو و بیچ اند۔“
بعد میں لفظ ”بیچ“ قلم زد کیا گیا، لیکن ۱۶۹۵ اعداد جیسا کہ ہم نے لکھا ہے
ان کو جوں کا توں رکھا ہے۔ ہم نے اس نسخے کا ایک ایک شعر مگر لیا۔ اصل تعداد
۱۷۹۶ ہے۔ صفحہ ۸۸ میں بارہویں سطر سے نواب محمد ضیاء الدین بہادر، شخص نیر بخش
اور مرزا یوسف علی خاں شخص عزیز کے دو تاریخی قطعات بعنوان ”قطعہ تاریخ الطبائع
دیوان“ اور قطعہ تاریخ الطبائع دیوان طبع زاو“ بالترتیب نثری طرح دیے گئے ہیں
اور بلا فصل اس اعداد سے شامل کیے گئے ہیں کہ طبیعت مکذّر ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں
قطعات بعد کے ایڈیشنوں سے حذف کیے گئے ہیں، اس لیے ہم ذیل میں ترتیب سے
درج کرتے ہیں:

”قطعہ تاریخ الطبائع دیوان — از نیر بخش“

ہوا ہے حضرت غالب کا مطبع دیوان ملائے فیض بہ گوچرگان ریختہ ہے
یہی کتاب ہے جس میں کہ لوستاوان بیان ریختہ ہے اور زبان ریختہ ہے
”بناے ریختہ“ استاد علی نے ڈالی ہے اسی سے قائم اسباب جہان ریختہ ہے
زمین شعر میں اترا ہے لفظ ایات سو یہ رسالہ ثانی نشان ریختہ ہے
”بناے ریختہ“ ایک اور دوسری تاریخ

بدین نیر بخش ”جہان ریختہ“ ہے
۱۲۷۸ ہجری

”قطعہ تاریخ الطبائع — مرزا یوسف علی خان عزیز“

سرور ریاض فضل محمد حسین خاں ہیں روایت بہار گلستان ریختہ
کہتے ہیں شعر خوب، سمجھتے ہیں شعر خوب تحسین شخص اور زبان دلیان ریختہ
چھاپا انھوں نے حضرت غالب کا کلیات وہ کلیات جس سے بڑی شان ریختہ

مطلوبہ دیوان غالب (سلسلہ سری گز) اور مطلوبہ نئے عبارت غالب

غالب کا میرزا اسد اللہ خاں ہے نام ہے واقعی وہ شیخ نیرتیاں ریختہ
لکھی عزیز خستہ نے تاریخ اظہار

حاصلہ کے سر کو کاٹ کے ”دیوان ریختہ“

(۱۲۸۶ھ = ۱۲۸۶-۸۷ = ۱۲۷۸ھ بمطابق)

اسی صفحہ ۸۸ میں عزیز کے ماذ کا تاریخ ”جہان ریختہ“ کے ساتھ ہی اہل مطبع
نے ہائیکوسوں سطر میں جلی قلم سے ”عبارت خاتمہ دیوان“ کے تحت غالب کے خط کو
شامل کیا۔ غالب پریس والوں کے نامعلوم طریقہ عمل سے اتنا برہم ہو گئے کہ انہوں نے
عبارت خط کی تمام سطریں، جو حوض اور حاشیہ کے ارد گرد تھیں، کاٹ دیں جیسا کہ کس
سے ظاہر رہتا ہے۔ آخر میں غالب نے اپنی مہر ثبت کر دی۔ مہر میں یہ عبارت ہے۔ ثم
الدولہ دیر الملک اسد اللہ خاں نظام جنگ بہادر۔ ۱۲۶ھ
قلم دوم خط کی عبارت یہ ہے: ۳۵

”داد کا خطاب غالب گزارش کرتا ہے کہ یہ دیوان اردو تیسری بار
چھاپا گیا ہے۔ قلمس و داد آئین میر قمر الدین کی کار فرمائی اور
خاں صاحب الطاف نشان محمد حسین خاں کی دہائی منقحی اس کی
ہوئی کہ دس جزو کا رسالہ ساڑھے پانچ جزو میں مطبع ہوا۔ اگرچہ
یہ المہار میری خواہ سے نہیں، لیکن ہر کاپی میری نظر سے گزرتی
رہی ہے اور الخط کی تصحیح ہوتی رہی ہے۔ یقین ہے کہ کسی جگہ
حرف غلط نہ رہا ہو، مگر ہاں، ایک لفظ میری منطق کے خلاف نہ
ایک جگہ، بلکہ سو جگہ چھاپا گیا ہے۔ کہاں تک بد؟ ناچار جاننا
پڑے ہی چھوڑ دیا، یعنی ”کسو“ بکاف کمور و سین معصوم و
داد معروف۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ لفظ صحیح نہیں، البتہ فصیح نہیں۔
قافیہ کی رعایت سے اگر لکھا جائے تو صیب نہیں، ورنہ فصیح بلکہ
اصح ”کسی“ ہے۔ داد کی جگہ یاے تختانی۔ میرے دیوان میں

خلوہ دیوان غالب (نسخہ سری گم) اور مکتوبہ نئے عبارت غالب

ایک جگہ قافیہ ”کسو“ پہ واو ہے اور سب جگہ ”کسی“ پہ یاء تخطائی ہے۔ اس کا اظہار ضرور تھا۔ کوئی یہ نہ کہے کہ یہ کیا آشفتہ بیانی ہے؟ قلّٰہ بس مایوسی ہوں۔

اس عبارت کے بعد اسی صفحہ (۸۸) کے حاشیے کی دائیں طرف یہ لکھا ہے: مطبع احمدی میں واقع دہلائے اموجان کے اہتمام سے ششویں محرم الحرام ۱۲۷۸ ہجری کو مطبوع ہوا۔

اس کے بعد یازدہم ۱۸۳۵ء ایکٹ کے تحت سید قمر الدین کی جانب سے بطور اجازت دیوان ہدا چھاپنے کی ممانعت اشتہار کے تحت درج ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ غالب نے اپنی تحریر قلم زد کرنے کے بعد ص ۸۸ کے دایں طرف کا حاشیہ ڈیڑھ انچ کا خط چپکا کر اوپر سے نیچے تک بڑھادیا اور پھر اس پر ذیل کا خط اپنے جلی قلم سے لکھا ہے:

جناب محمد حسین خاں کو میرا سلام پہنچے۔ دو رات دن کی محنت میں میں نے اس نسخے کو صحیح کیا۔ غلط نامہ بھی اس میں درج کر دیا ہے۔ گویا اب غلط نامہ بے کار محض ہو گیا ہے۔ خاتمے کی عبارت کیا۔ میرا بیان کیا۔ میر قمر الدین کا اظہار اب کچھ ضرور نہیں۔ کس واسطے کہ اب یہ کتاب اور مطبع میں چھاپی جائے گی۔ یہ جملہ گویا مسودہ ہے۔ اسی کو بھیج دیجیے۔ غالب ۱۲۔

دیوان غالب کے اس نسخے میں کوئی غلط نامہ نہیں ہے۔ ہم نے اس کا بغور نظر مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس میں غالب نے اصلاح نہیں کی۔ معلوم نہیں کہ عرشی صاحب کے پاس وہ کون سا نسخہ تھا جس میں غلط نامے کے کاتب کا نام محمد مقصود چھپا ہے۔ کاش عرشی صاحب اس کے بارے میں مزید تفصیلات بیان فرماتے۔ میرے خیال میں غالب نے جس نسخے میں غلط نامہ مرتب کیا تھا وہ علقہ کے برابر ہے اور اس کا کہیں نام و نشان نہیں مل رہا ہے۔ راقم کو عرشی مرحوم

والشراء بيمين الث دن

CURSED 1861



وسطی احمد علی تمام اموجان طبع

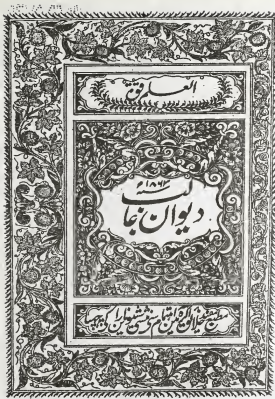
فانم ہمیں کہ خضر کی ہم چرو دی کریں ایں ساکنان کو چٹ دلا دے دیکھنا	جا اگر ایک بندگ ہیں بے بند — ط نکو کہیں جو غالب آشتی سرلی
--	--

کوئی دن گر زندگانی اور ہے آتش و دوزخ میں پیدا کرے کہاں بار آجیو میں ادنیٰ رنجشیں رہی خط نہ دیکھتا ہی نامہ بر طالع احمد ہیں اکشر نجوم ہر یکین غالب بلا نہیں تمام	اپنی چین اپنی بنانی اور ہے سوز چھای بنانی اور ہے پر کہہ اب کی سرگانی اور ہے کہہ تو پیغام زبانی اور ہے وہ جانی آجائے اور ہے ایک مرکز ناگہانی اور ہے
--	---

کوئی امید بر حسین آئے سوت کا ایک جن حسین ہے اگلی آتی تھی حال دل پر آئے جانتا ہوں ثواب علامت وزہ ہی کہہ ایسی ہی بات جو چہ ہوں کہیں نہ چنوں کہ یاد کرتے ہیں داغ دل گر نظر حسین آئے ہر دو ان جن جہان نے جگہ ہی سرتی ہیں اور زوہ میں سرتی کے کہیں نہیں جاوگی غالب	کوئی صورت نظر حسین آئے بندگیوں رات پر حسین آئے اب کس بات پر حسین آئے پر طبیعت اور ہر حسین آئے ورنہ کیا بات کہ حسین آئے سہری آواز کہ حسین آئے جو ہی اسی چارہ کہ حسین آئے کہہ چارہ ہی خبر حسین آئے سرت آتی ہی پر حسین آئے شرم نگو کہ حسین آئے
--	--

دل نادان بھی ہوا کیا ہے ہم ہیں شقائق اور بروہ بنو ہیں ہی نہ میں زبان دیکھتا ہوں بلکہ نہیں ہیں کہ — سوجو	آخر اس درد کی دو اکبا ہے یا الہی یہ ماجرا کیا ہے کاش بوجہ کہ راکھا ہے پر یہ ہنگامہ اسی خدا کیا ہے
--	--

دیوان غالب نقول امواج کا ایک قطر



المسوق

۱۸۶۳
دیوان نیا

مطبع میرزا آقاخان قزوینی در شهر تبریز

مطلوع دیوان غالب (نوسری نگر) اور مملوک نے عہد غالب

کی اس راے سے اتفاق ہے کہ:

بکمال غالب میرزا صاحب نے اخلاط کی درستی جس نئے پر کی تھی
از داؤد سہو رقتہ اس پر نہیں لکھا بلکہ کسی اور بغیر صحیح شدہ نئے پر
لکھ دیا۔

وہ غیر صحیح شدہ نسخہ وہی ہے۔ جو کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ مجھے
جناب مرثی مرحوم سے اس بات پر اختلاف ہے کہ جب غالب کو ”اس پر شبہ ہوا تو وہ
رقتہ صحیح شدہ پر لکھ کر بھیجا۔“ (نوسری مرثی، ص ۱۳۰)

مطلع احمدی نسو آصفیہ کے مصلحہ میں چھٹا اور ساتواں شعر یہ ہیں:

(۶) بنشے ہے جلوہ گل ذوق تماشا غالب

چشم کو چاہے ہر رنگ میں دا ہو جانا

(۷) تاکہ تھہ پر کھلے اعجاز ہوائے صیقل

دیکھ برسات میں سبز آئینے کا ہو جانا

حاشیے میں شعر نمبر ۶ کے دہائی طرف ”ح“ (حاشیہ) اور شعر نمبر ۷ کے ساتھ
”م“ (مثنی) لال روشنائی سے لکھا گیا ہے یہ غالباً غالب نے لکھا ہے۔ مصلحہ میں
قصیدہ ”ساز یک ذہ نہیں فیض جہن سے بے کار“ کے مطلع جانی جواس مصرع سے
شروع ہوتا ہے ”فیض سے حیرے ہی اے شمع شہستان بہار“ کے سبھی اشعار کے آخری
الفاظ چھپنے سے رہ گئے تھے۔ یہ الفاظ غالباً مرزا صاحب نے لال روشنائی سے اپنے
ہاتھ سے لکھے ہیں:

گلزار، گوہر بار، اسرار، غم خوار، آئینہ دار، دیوار، سرشار

اسی طرح قصیدہ ”دہر جز جلوہ یکنائی معشوق نہیں“ کے دوسرے اور تیسرے
شعر کے مصرعوں کے الفاظ (کافیے) ”خود ہیں“ اور ”نہ دیں“ غالب ہی کے ہاتھ کے
لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

جناب مالک رام صاحب نے دیوان غالب کا جو صدی ایڈیشن پیش غالب

مختصر دیوان غالب (نصیری نگر) اور مطلوب نئے حیات غالب

کی صد سالہ تقریبات پر ۱۹۶۹ء میں صد سالہ یادگار کمیٹی کی طرف سے شائع کرایا اس کے متن کی بنیاد موصوف نے مطبع نکلای کان پور ۱۹۶۲ء پر رکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

جب غالب نے مطبع احمدی کا متن دیکھ کر اسے درست کر کے، دیوان مطبع نکلای میں چھپوایا، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انھوں نے متن ہمیشہ کے لیے خود طے کر دیا۔ اب اس سے پہلے کے ایڈیشنوں کو ہم نہ صرف متن میں استمال نہیں کر سکتے بلکہ وہ شاید اختلاف نسخ کے تحت بھی نہیں آئیں گے۔^{۳۵}

مالک رام صاحب کی تردید میں جناب رشید حسن خاں نے ایک مضمون لکھا جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ مطبع نکلای کان پور کا نسخہ دیوان غالب مستند نہیں ہے۔ جناب مرثی صاحب کی بھی یہی رائے ہے۔ مجھے یہ نسخہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، اس لیے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔^{۵۶}

نسخہ مطبع احمدی (آمنیہ) کی خاص بات یہ ہے کہ غالب نے جس جلی قلم سے سطور ۸۸ میں مالک مطبع محمد حسین خاں کو خط لکھا اسی قلم سے چوتھے دیوان کے سچ میں نئے سطحوں کے اعداد ڈالے ہیں۔ سطور ۸۳ میں ذیل کی عبارت چھپ گئی ہے:

آتش بازی ہے جیسے عقل اطفال ہے سوز جگر کا بھی اُسی طور کا حال
تھا سوچو عشق بھی قیامت کوئی لڑکوں کے لیے گیا ہے کیا کھیل نکال
ربانی کے بعد چاہے میں ۱۰۲ کا نمبر ڈالا گیا۔ اس طرح دیوان تک ۱۰۳

سطحوں کے نمبر ڈالے گئے ہیں اور یہ سب نمبر غالب ہی نے لکھے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ نسخہ کان پور میں بھی اسنے ہی صفحات ہیں۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ غالب نسخہ آمنیہ ہی کو درست کرنا چاہتے تھے۔ لیکن سوا دوسرے نسخے کی تصحیح کی اور محمد حسین خاں کے نام غلطی سے خط نسخہ آمنیہ کے آخر میں چکا دیا۔ اس نسخے میں غالب نے جن صفحات کے نمبر اپنے قلم سے لکھے ہیں وہ یہ ہیں:

۵، ۷، ۹، ۱۰، ۱۲، ۱۳، ۱۷، ۱۹، ۲۲، ۲۳، ۲۷، ۳۲، ۵۸، ۶۰، ۶۴، ۶۳، ۶۵،

مطلوبہ دہان غالب (نسخہ سری نگر) اور مطلوبہ نئے عبارت غالب

۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲۔

اوپر یہ بیان ہو چکا ہے کہ مطبع احمدی کے نسخے سے غالب بہت کبیدہ خاطر ہوئے تھے۔ اس کی اشاعت کے کوئی ایک ہفتے کے بعد انھوں نے میر مہدی مجروس کے نام ۸ اگست ۱۸۶۱ء مطابق ۳۰ محرم ۱۲۷۸ء کو ذیل کا خط لکھا:

دوستان اردو چھپ چکا۔ ہاں! لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دوستان چھاپا، اس کو آستان پر چڑھا دیا۔ حسن خط سے الفاظ کو چمکادیا۔ دلی پر اور اس کے پانی پر اور اس کے چھاپے خانے پر لعنت! صاحب دوستان کو اس طرح یاد کرتا، جیسے کتے کو آوارہ دے۔ ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں، کاپی نگار اور قلم۔ متوسط، جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا، وہ اور تھا۔ اب جو دوستان چھپ چکے حق تصنیف ایک لمحہ کو مٹا۔ غور کرتا ہوں کہ وہ الفاظ غلط جوں کے توں ہیں، یعنی کاپی نگار نے نہ بتائے۔ ناچار غلط نامہ لکھا۔ وہ چھپا۔ بہر حال غلط و ناغوش کئی جلدیں مول لوں گا۔ اگر خدا چاہے تو اسی ہفتے میں تین جلد اصحاب غلط کے پاس پہنچ جائیں۔ نہ میں خوش ہوا ہوں نہ تم خوش ہو گے۔ مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خان، بہتم مرزا امروہا، مطبع شاہدرے میں... خط ڈاک میں بھجواؤ، کتاب ڈاک میں پہنچ جائے گی۔

غالب نے اس دوستان کا ایک نسخہ اشاعت کے ایک ماہ بعد آخر اگست ۱۸۶۱ء (آخر صفر ۱۲۷۸ء) کو نواب میر تراب علی خاں علیا مالک بہادر سالار جنگ اڈل (متوفی ۱۳۰۰ء) کو حیدرآباد بھیجا تھا۔ یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ نسخہ آصفیہ بھی ہو۔

نسخہ آصفیہ کے بارے میں ماہرین غالبیات کو غلط فہمیاں اس لیے پیدا ہوئی تھیں کہ انھوں نے اسے دیکھے بغیر ہی یہ رائے قائم کی تھی کہ اس کی گنج غالب نے کی

خلو دراجن غالب (نظم سری نگر) اور مضمون نئے نجات غالب

اور یہ مستحسنہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ غالب اس کی طباعت، اظہار اور اخلاط کی کثرت سے بہت رنجیدہ ہو گئے تھے۔ ذیل میں چند غزلیں نمونے کے طور پر درج کی جاتی ہیں:

درد منت کشی روا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا برا نہوا
جمع کرتی ہو کیوں رقیبوں کو اک تماشا ہوا گلا نہوا
ہم کہاں قسمت آزمائے جائیں تو ہی جب بخت آزا نہوا
کتنی شیریں ہیں تیری لب کہ رقیب گالیاں کہا کے نکرا نہوا
ہی خیر گرم بدن کی آنکھ آج ہی گھر نہیں بدایا نہوا
کہا وہ نرود کی خدائی ہے بندے میں میرا بھلا نہوا
جان دی، دی ہوئی آنکھ تھی حق تو یوں ہی کہ حق ادا نہوا
دھم کر دپ گیا ہو نہ عیبا کام کر رگ گیا روا نہوا
رہزنی ہی کہ دل ستانی ہے لیکے دل دلتاں روا نہوا
کچھ تو پڑھنی کہ لوگ کہتی ہیں

آج غالب غزل سرا نہوا (صفحہ ۱۱)

(۲)

آہ کو سہاگنی ایک عمر اثر ہوتی تک
کون جیتا ہی تری زلف کے سر ہوتی تک
دام ہر موج میں ہے ملتے صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزری ہی قطرہ پہ گھر ہوتی تک
ماشتی مہر طلب اور تمنا چاہ
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہوتی تک
بہی مانا کہ تحافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خیر ہوتی تک

خلوت دیوان غالب (نثری مگر) اور ملبور نے حمایت غالب

پر تو خود ہی ہی خیم کو ہی کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک حمایت کے نظر، دقتی تک
یکھڑ پیش نہیں فرصت سے غافل
گرمی بزم ہی اک رقص شرر ہوتی تک
غم سے کا اسد کس سے ہو بزم مرگ طالع
شع ہر رنگ میں جلتی ہی سحر ہوتی تک (صفحہ ۲۵)
(۳)

نہدی مگر مری مریسی تیلے لیے امتحان اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نسبی
خار خار الم حسرت دیدار تو ہے شوق گلچین گلستان تیلے لیے
ی پرستان غم ہی مہر سے لگائی ہی ہے ایکدن مگر نہوا ہو میں ساقی نسبی
نفس قیس کہ ہی چشم و چراغ صرا مگر نہیں شع یہ خانہ لیے نسبی
ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی روتی نوحہ غم ہی سکی نوحہ شادی نسبی
د ستائش نہ ملے کی پروا مگر نہیں ہیں میری اشعار میں معنی نسبی
عشرت صحبت خواباں ہی قیمت سمجھو
نہوتی غالب اگر مر طیبی نسبی (صفحہ ۵۳)

دیوان غالب نسخہ آگرو۔۔۔ اس سے مراد غالب کا وہ دیوان ہے جو آگرے
میں غالب کے نہایت معتبر شاگرد غشی شیو نرائن تھکس آرام (۱۸۳۳ء، ۱۸۹۸ء) کے
نیر اجتام انجی کے مطبع مفید خلافت میں ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا۔ ”اردوئے معلّے“ میں
ان کے نام غالب کے ۳۰ خطوط درج ہیں۔ ان میں بعض خطوط غیر معمولی اہمیت کے
حامل ہیں۔ غشی صاحب کی فرمائش سے ہی مرزا نے لارڈ الین برٹن کی تعریف میں
۱۸۵۸ء میں ۲۱ شعر کا قصیدہ تصنیف کیا۔ دو شعر قابل ذکر ہیں:

آسیدوار حمایت شیو نرائن کہ آپ کا ہے جنک غوار اور دولت غوار
یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں عز و جاہ کے ساتھ تمہیں اور اس کو سلامت رکھے سدا اللہ

فشی صاحب چندہ روزہ گلدستہ ”معیار اشعرا“ شائع کرتے تھے۔ ایک شمارے میں انھوں نے لکھا تھا کہ کوئی امیر اپنی غزلیں بھیجتے ہیں۔ جب تک ان کا نام و نشان معلوم نہ ہوگا ہم ان کے اشعار نہ چھاپیں گے۔ غالب نے فشی صاحب کا یہ بیان ”معیار اشعرا“ میں دیکھا تو انھوں نے یکشنبہ ۱۲ جون ۱۸۵۹ء کو ان کے نام ایک خط میں لکھا:

امیر میرے دوست ہیں اور امیر احمد ان کا نام ہے اور امیر تقصی کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے ذی عزت باشندوں میں ہیں اور وہاں کے بادشاہوں کے نزدیک صاحب رہے ہیں اور اب وہ رام پور میں نواب صاحب کے پاس ہیں۔ میں ان کی غزلیں تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔ میرا نام لکھ کر ان غزلوں کو چھاپ دو، یعنی ”غزلیں غالب“ نے ہمارے پاس بھیجیں اور اس کے کھینے سے ان کا نام اور حال معلوم ہوا۔ نام اور حال جو میں اوپر لکھ آیا ہوں اس کو آپ ”معیار اشعرا“ میں چھاپ کر ایک دو وقت یا چار وقت رام پور ان کے پاس بھیج دو۔

ایک مرتبہ شیونرائٹ نے غالب کے نام کے ساتھ نواب اور میرزا لکھا تھا۔

انھوں نے جواب میں لکھا:

سنو میری جان! نوابی کا مجھ کو خطاب ہے ”نعم الدولہ“ اور اطراف و جوارب کے امرا سب مجھ کو ”نواب“ کہتے ہیں، بلکہ بعض انگریز بھی۔ چنانچہ صاحب کشتربہادر دہلی نے جو ان دنوں میں ایک روپکاری بھیجی ہے تو لکھانے پر ”نواب اسد اللہ خان“ لکھا۔ لیکن یہ یاد رہے، ”نواب“ کے لفظ کے ساتھ ”میرزا“ یا ”میر“ نہیں لکھتے، یہ خلاف دستور ہے۔ یا ”نواب اسد اللہ خان“ لکھو یا ”میرزا اسد اللہ خان“ لکھو اور ”بہادر“ کا لفظ

مطلوع دیوان غالب (نستعلیق نمبر) اور مطبوعہ نئے عہدات غالب

دونوں حال میں واجب اور لازم ہے۔

فطی شیونرائن غالب کے خطوط چھاپنا چاہتے تھے۔ انھوں نے چھاپنے کے لیے اجازت مانگی۔ غالب نے ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء کے خط میں چھاپنے سے منع کیا کہ ”ان رقعات کا چھاپنا میرے خلاف طبع ہے۔“ یہ وہی شیونرائن ہیں جن کے خط کے جواب میں غالب نے لکھا تھا کہ ”اگر یہ مطلع میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔“

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے کہ شیونرائن نے آگرہ میں ایک مطبع مطبوعہ خلافتی کے نام سے قائم کیا۔ اس میں غالب کی دو کتابیں ”دھنڈ“ (۱۸۵۸ء) اور ”دیوان غالب“ (۱۸۶۳ء) شائع ہوئیں۔ لوگوں کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ دیوان غالب مطبوعہ کھای کان پور (۱۸۶۳ء) ایک مستجر اور مستند نسخہ ہے اور وہ نسخہ آصفیہ کا بھیج شدہ ایڈیشن ہے۔ غالب پہلے سے ہی اس نسخے یعنی نسخہ مطبع احمدی سے بیزار تھے۔ وہ اغلاط سے بڑھتا۔ اس کے بعد انھوں نے نسخہ کان پور سے کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ اس کی اشاعت سے بھی غلام خوش نہ تھے۔ اس میں تیر دہائیاں کی تقریباً شامل نہیں کی گئی۔ غالب نے مطبع احمدی کے نسخے (۱۸۶۱ء) سے قبل اپنے دیوان کے قلمی نسخے کی نقل فطی شیونرائن کو بھیجی تھی جو بعد سے پہلے ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) کا مکتوبہ رام پور میں موجود تھا۔ غالب نے اس کی اشاعت میں دلچسپی دکھائی تھی۔ شیونرائن صاحب نے ایک خط میں مرزا صاحب سے خواہش کی تھی کہ وہ دیوان غالب چھاپنا چاہتے ہیں، اس لیے انھیں مکمل دیوان فراہم کیا جائے۔ مرزا نے اس کے جواب میں ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء کے خط میں مطلع کیا:

اردو کے دیوان چھاپنے کے ناقص ہیں۔ بہت غزلیں اس میں نہیں ہیں۔ قلمی دیوان جو اتم اور اکمل تھے، وہ لٹ گئے۔ یہاں سب کو کہہ رکھا ہے کہ جہاں پکنا ہوا نظر آئے لے لو۔ تم کو بھی کلمہ سمجھا، اور ایک بات اور تمہارے خیال میں رہے کہ میری غزل پندرہ سولہ بیت کی بہت شاذ و نادر ہے۔ بارہ بیت سے زیادہ اور نو شعر سے کم نہیں۔ جس غزل کے تم نے پانچ شعر کہے ہیں، یہ نو

مطلوبہ دیوان غالب فائنل سری (میں) اور مطلوبہ نئے عیادت غالب

شعری ہے۔

اس غزل کا مطلع یہ ہے:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے
فتنی صاحب نے ایک اور خط میں دیوان بھیجنے کی فکر مندی ظاہر کی۔ مرزا اس
کے جواب میں لکھتے ہیں:

دیوان ریختہ اتم و اکمل کہاں تھا۔ ہاں، میں نے غدر سے پہلے
(۱۸۵۵ء) نکسوا کر نواب یوسف علی خان بہادر کو رام پور بھیج دیا
تھا۔ اب جو میں دہلی سے رام پور جانے لگا تو بھائی ضیاء الدین
خاں نے مجھ کو تاکید کردی تھی کہ نواب صاحب کی سرکار سے
دیوان اردو لے کر اس کو کسی کاتب سے نکسوا کر مجھ کو بھیج دینا۔
میں نے رام پور میں کاتب سے نکسوا کر بسملی ڈاک ضیاء الدین
خاں کو دہلی بھیج دیا تھا۔ ان کو نکسا ہے کہ اگر چھاپا شروع نہ ہوا تو
نہ چھاپا جائے اور دیوان جلد میرے پاس بھیجا جائے۔ اگر دیوان
آگیا تو فورا تمہارے پاس بھیج دوں گا۔

غالب کے ایک اور خط مؤرخہ ۱۰ جنوری ۱۸۶۲ء سے معلوم ہوا کہ وہ اپنی
نصویر اور دیوان غالب نسخہ رام پور فتنی شیونرائی کو اشاعت کے لیے بھیج چکے تھے۔
مؤرخانہ کر نے دیوان ۱۸۶۳ء میں اپنی نگرانی میں شائع کیا۔ اس کی اشاعت میں فتنی
صاحب کو غالب کا پورا تعاون حاصل رہا۔ راقم حروف کو ہندوستان میں اس کا کوئی نسخہ
درستاب نہ ہو سکا۔ اس کا ایک مکمل اور عمدہ نسخہ نیویارک کی لائبریری میں موجود ہے۔
اس کا ٹکس میرے کرم فرما ڈاکٹر سید تقی حابڈی صاحب ایم ڈی نے (جن کا مطلب
نیویارک میں ہے) مجھے حمایت فرمایا۔ دیوان کی ابتدا میں دیباچہ غالب کے اوپر
لائبریری کی صہر ہے جس میں 579120 A نمبر نمایاں ہے۔ میں نے اس کا بغور مطالعہ
کیا اور یہ رائے قائم کر لی ہے کہ غالب کی زندگی میں دیوان کے چھٹے ایڈیشن شائع

مخلوط دیوان غالب (نسخہ سری گن) اور مطبوعہ خط حیات غالب

ہوئے ہیں ان سب میں یہ نسخہ مستند، معتبر اور عملی حروف میں لکھا ہوا خوب صورت ہے۔ کہیں کوئی قریش خراش نہیں یا دیکھ نے نہیں چاہے ہے۔ آغاز میں غالب کا دیباچہ ہے۔ اس کے بعد غزلیں شروع ہوتی ہیں جو صفحہ ۱۳۲ میں اس رباعی پر ختم ہوتی ہیں:

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالب
والہ کہ شب کو غنیمت آتی ہی نہیں سونا سوکند ہو گیا ہے غالب
رباعی کے بعد اسی صفحے میں نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر بخش کی تقریظ

شروع ہوتی ہے جو صفحہ ۱۳۶ میں اختتام پذیر ہوتی ہے۔ آخر میں لکھا ہے کہ:

اشعار شعری شعار غزل و قصیدہ و قطعہ و مثنوی و رباعی یکجا اور

بمقصد و نودواحد۔

یعنی اس میں ۱۷۹۲ اشعار ہیں۔ چوں کہ یہ دیوان نادر ہے اس لیے نیر بخش کی تقریظ اور اس کتاب غزلیات کا نکتہ شامل مضمون کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دیوانا غالب مطبع احمد دہلی ۱۳۶۱ھ ہجری کا سرورق اور غالب کی دوسری اہم تحریریں شامل کی جاتی ہیں تاکہ محفوظ رہ سکیں۔



حوالے اور حاشیہ

- | | |
|-----|---|
| ۱۵۱ | دیوان غالب طبع چلی، نسخہ عربی |
| ۲۵۲ | دیوان غالب نسخہ کالی داس گپتا روضا، دار سوم، ۱۹۹۵ء |
| ۳۵۳ | مسررت موہانی (شرح دیوانا غالب) اور کالی داس گپتا روضا (دیوان غالب کمال) "مہارست |
| | عالم دیوانا" کے بارے میں غامض ہیں۔ |
| ۳۵۴ | دیوان غالب سرخشا، ایک نام، مطبوعہ آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۶۹ء |
| ۵۶۵ | ادبی تحقیق: مساکین اور تجزیہ، ایچ کینٹل بک، داکس، علی گڑھ، ۱۹۷۸ء |

مرزا غالب کی تاریخ گوئی

مرزا واصل غزل کے شاعر ہیں۔ دیگر اصنافِ سخن کے ساتھ ساتھ انھوں نے تاریخیں بھی کیں۔ لیکن یہ تاریخیں تاریخ یا موتوں وغیرہ کی تاریخوں کے ہم پلہ نہیں ہیں۔ تاریخ گوئی سے انھیں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ البتہ بعض اصحاب کے کہنے پر مجبوراً تاریخیں لکھتے تھے۔ ان کے لیے یہ فن قدرے مشکل تھا اور وہ اس سے عاجز تھے۔ ان کی تاریخوں کے مادے زیادہ تر قلمیے اور تحریرے میں ہیں۔ ایک خط میں میاں داؤد خاں سیاح کو لکھتے ہیں:

بھائی تمھاری جان کی اور اپنی ایمان کی قسم کہ میں فنِ تاریخ گوئی اور معما سے بیگانہ محض ہوں۔ اردو زبان میں کوئی تاریخ میری نہ سنی ہوگی۔ فارسی دیوان میں دو چار تاریخیں ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ مادہ اوروں کا ہے اور اشعار میرے ہیں۔ تم کہے کہ میں کہتا ہوں۔ حساب سے میرا جی گھبراتا ہے اور مجھ کو جڑ لگانا نہیں آتا ہے۔ جب کوئی مادہ بناؤں گا، حساب درست نہ پاؤں گا۔ دو ایک دوست ایسے تھے کہ اگر حاجت ہوئی تو مادہ تاریخ وہ مجھے

محفوظہ لادیتے ہیں۔ مولودوں میں کرتا اور اگر آپ میں نے
 ماٹے کی فکر کی ہے تو یہی حساب حمل منظور رکھا ہے۔ تو ایسے
 ایسے قہمے اور محزبے آگئے ہیں کہ وہ تاریخ ہنسی کے قائل ہوگئی
 ہے۔ کلکتے میں قاضی القضاۃ سراج الدین علی خاں مرحوم کی قبر پر
 مسجد بنی ہے۔ ان کے بچے مولوی ولایت حسین خاں نے
 استدعاے تاریخ کی۔ میں نے لکھی چٹاں چہ وہ غاری دیوان میں
 موجود ہے:

مفتی محل از بے تاریخ بنا
 ایما بوسے من ز رو احرام کرو
 کفتم بوسے بدیدہ خوشا خاند خدا
 شد حشکین دے کہ نظر در کلام کرو
 خاشاک زلفت و پائے ادب در کھنڈ ریخت
 ایہام را بہ تجزیہ معنی تمام کرو

واسطے خدا کے غور کرو۔ ”خوشا خاند خدا۔“ ماڈہ۔ پھر اس میں
 خاشاک^{۱۲۱} کے عدد دو کرو۔ نو سو اکیس ۹۲۱ کا تجزیہ، پھر بھی دو
 اور زیادہ رہے۔ پائے ادب توڑا۔ بھلا یہ کوئی تاریخ ہے۔ مگر
 ہاں، حساب کے قاعدے سے باہر۔ کچھ معنی سبکی کے طور پر میرا
 ایجاد ہے اور وہ لطف رکھتا ہے۔ ایک شخص ۱۲۳۸ھ میں مرزا اس
 کی تاریخ میں نے لکھی:

ز سال واقعہ میرزا مسیح یک
 مات راست شمار امیر ایجاد
 صحیفہ ہائے سہادی متین از عشرت
 حدیقہ ہائے بہشتی متخلص از نقاد

اگر بارہ یعنی بارہ سو۔ پھر کتب سادی چار۔ دہا کے چار، یعنی
چالیس۔ بہشت آٹھ۔ چالیس اور آٹھ اڑتالیس۔

۱۲۳۸۔ دوسری تاریخ بارہ سو ستر کی:

از برویچ پہر جوے آت

عشرات از کواکب سیار

برج بارہ، سات دہا کے ستر۔۔۔ وہ دوست جو ماڈہ و محظوظیج
تھے وہ جنت کو مدحارے۔^{۲۵۲}

غالب کا ایک خط کتاب ”مناظر متقی و دجی“ میں شامل ہے۔ اس کے ساتھ
حالی اور دشتاں خیر کے ہاتھ کی تحریریں بھی درج ہیں۔ غالب کا خط بھی انہی کے ہاتھ کا
لکھا ہوا مہر کے ساتھ درج ہے۔ ان تحریروں کا ٹکس ہمارے مضمون ”میرزا غالب اور
تاریخ کوئی“ مطبوعہ ”فتوش“ لاہور ”غالب نمبر“ (۳) شمارہ ۱۱۶ بابت ۱۹۷۱ء میں
دیکھا جاسکتا ہے۔ غالب اپنے خط میں میرزا میرزا بیگ کی تاریخ وفات اور دوسری تاریخ
۱۲۷۰ء کے بارے میں لکھتے ہیں:

یہ سب دنیا کہ اسد کہلاتا ہے اور قلعہ اپنا غالب بتاتا ہے، قول
السامور محذور کا پاس کرتا ہے اور حضرات انجمن فیاض سے التماس
کرتا ہے کہ میں استقلا کے سزاوار نہ تھا اور اب جو پوچھا گیا تو
سچ کچ کہتا ہوں کہ میں فنی تاریخ و معما سے بیگانہ ہوں۔ دیوان
میں جو تاریخیں مندرج ہیں۔ بیشتر ماڈے اوروں کے، قلعے فقیر
کے ہیں۔ کبھی کوئی ماڈہ بھی عامیانہ کہہ دیا ہوگا۔ ہاں حضرت،
مہدہ فیاض نے گنجینہ معنی سے بہت بھ کو دیا۔ میں نے سراسر
قصیدہ و غزل و مثنوی و رباعی میں صرف کیا اللہ بزرگ قوت ابدار
ماڈہ تاریخ میں نیا شیوہ نکالا:

د سالہ واقفہ میرزا مسیح بیگ

آت راست شمار اتھہ اعماور

مجھ پر ہے سادہ مثنوی از عشرات
حدیقہ ہے بہشتی شخص از اتحاد

ایضا

از بدویچ سپہر جوے مات
عشرات از کواکب سیار

یہ دونوں قلمیے کلیات قادری مطہرہ مطہرہ ”اودھ اخبار“ لکھنؤ میں
چھاپے گئے ہیں اور وہ مجلد مجموعہ بلاد ہند میں پہنچ گئے ہیں۔
اشرف الہیاد حیدرآباد میں اگر دو چار نہ ہوں گے تو ایک نسخہ میرا
بھیجا ہوا جناب شفی صبیح اللہ خان دکن کے پاس ضرور ہوگا۔ اس
میں مشاہدہ کیا جائے۔ اب یہ اجماع حکم احباب جس فن کو نہیں
جانتا اس کے خصوص میں عرض کرتا ہوں کہ میں نے مسائل اس
سنیچے کے سوا کبھی نہیں دیکھے۔ اب جو دیکھے تو ہالہ اس سے زیادہ
نہیں سمجھا کہ ایک ”گروہ“ ”تائے دراز“ کے چار سو عدد اور ”تائے
مستدریہ“ کے پانچ عدد لیتا ہے جس نہ جناب نواب وجیہ الدین
بہادر مقلی اپنے دعوے میں منفرد ہیں اور نہ حضرت سید صاحب
میر محمد دکنی اپنے دعوے میں تھا ہیں۔ جو ایک جہت اختیار کروں تو
دوسرے جہت والوں کو کہ وہ بھی اشخاص کثیر اور سب فاضل و
صاحب تحریر ہیں۔ کیا جواب دوں اور ان کے دلائل کو کن دلائل
سے رد کروں۔ امید کہ حضرات طرفین بموجب مفہوم ”لا یكلف
اللہ نفسا الا وسعہا“ اس پر ہتکار و شش سالہ ضعیف الخواس کو حق
فرمادیں۔

مرزا فی تاریخ کوئی کو لہجہ اور پست درجے کی شاعری لکھتے تھے۔ مرزا تقی
کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

فی تاریخ کو دونوں مرتبہ شاعری جانتا ہوں اور تصحاری طرح سے

یہ بھی میرا عقیدہ نہیں ہے کہ تاریخ وقات لکھنے سے ادائے حق محبت ہوتا ہے۔ بہر حال، میں نے فشی نبی بخش مرحوم کی تاریخ رحلت میں یہ قطعہ لکھ بھیجا۔ فشی قرالدین صاحب نے ڈاؤنڈ کیا۔ قطعہ یہ ہے:

شیخ نبی بخش کہ با حسن خلق
داشت مذاق سخن و فہم تیز
سال و قاتل ز پے یادگار
با دلی زار و مژہ و دجلہ ریز
حواشم از غالب آشفند سر
گفت بدہ طول و کجہ "رتخیو"
(۱۲۷۷ھ)

ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ کوئی لفظ چالیس اعداد نکال لیا کرتے ہیں، بلکہ قید معنی دار ہونے کی بھی مرتفع ہے۔ جیسا کہ یہ مصرع ہے:

دو سال غریب ہر آنکہ نامہ چند

انوری کے قصاید کو دیکھیں، دو چار جگہ ایسے الفاظ قصیدے کے آغاز میں لکھے ہیں جس میں اعداد سال مطلوب نکل آتے ہیں۔ اور معنی کہہ نہیں ہوتے۔ لفظ "رتخیو" کیا پاکیزہ معنی دار لفظ ہے اور پھر واقع کے مناسب۔ اگر تاریخ ولادت یا تاریخ شادی میں یہ لفظ لکھتا تو بے شبہ نامستحسن تھا۔ قصہ مختصر اگر تاریخ کی فکر موجب ادائے حق موقوفات ہے تو میں حق دوستی ادا کر چکا۔ *

نواب علانالدین احمد خاں طائی کا لڑکا فوت ہو گیا۔ انھوں نے مرزا سے

تاریخ لکھنے کی فرمائش کی۔ مرزا اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

سبحان اللہ! میں نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی یا ولادت کی

تاریخ سنی، یا اب رحلت کی تاریخ لکھنی پڑی۔ پروردگار تم کو جیتا رکھے اور قسم الہیہ عطا کرے۔ میاں، اس کو سب جانتے ہیں کہ میں ماژہ تاریخ نکالنے میں عاجز ہوں۔ لوگوں کے ماتے دیے ہوئے نظم کر دیتا ہوں اور جو ماژہ اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہوں وہ بیشتر لکھ ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اپنے بھائی کی رحلت کا ماژہ ”در پنج دیوانہ“ نکالا۔ پھر اس میں سے ”آہے“ کے عدد گنوائے۔ تمام دوپہر اسی فکر میں رہا۔ یہ نہ سمجھتا کہ ماژہ ڈھونڈا۔ تمہارے نکالے ہوئے دو لفظوں کو تاکا کیا کہ کسی طرح سات اس پر بڑھاؤں۔ ہارے ایک قطعہ درست ہوا، مگر تمہاری زبان سے لیکن گویا تم نے کہا ہے۔ پانچ شعر میں تین شعر دایہ۔ دو موشع مدعا، لیکن میں نہیں جانتا کہ تعبیہ اچھا ہے یا برا ہے۔ ہاں، اتفاق تو طبعی ہے خال سے کچھ میں آتا ہے اور شاید لوریج هزار پر کندوانے کے قابل نہ ہوں:

در گریہ اگر دہلای ہم چہمی ما کرد
بچی کہ شود ابو بہاری چغل از ما
تاچار بکرسم شب در دزد کہ اس بیل
پاشد کہ بد کالیو آب و گل از ما
تفتنی کہ نگہدار دل از کشمکش غم
خود کرد بر آورد غم جاں غسل از ما
بچی شد د از شطہ سوز غم ہجرش
چوں شمع دزد و دزد بسر حصول از ما
غم دیدہ نیسے بچے تاریخ و قاتل
بنوشت کہ در تاریخ پیر سوخت دل از ما

”۶“ کے عدد ۴۱، ”۷“ کے عدد ۳۳، ”۸“ میں سے ”۷“ گیا
 کو ۴۱ میں سے ۳۳ گئے، باقی رہے سات وہ ”تاریخ پیر“ پر
 بڑھائے۔ ۱۲۷۴ ہجری آئے۔^{۵۶}

نواب علاء الدین احمد خاں کے یہاں لڑکا پیدا ہوا۔ مرزا سے فرمائش کی گئی
 کہ وہ قطعاً ولادت اور تاریخی نام کہہ دیں۔ مرزا نے اس کے جواب میں جو مضر بیان
 کیا، اس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ تاریخ کے گو کہ وہ حد سے انہیں کس قدر الجھن
 اور طبعی بند تھا۔ لکھتے ہیں:

مولانا لکھی ا کیوں تھا ہوتے ہو؟ ہمیشہ سے اسلاف و اخلاف
 ہوتے چلے آئے ہیں۔ اگر خیر خلیفہ اول ہے، تم خدا فرماتی ہو۔
 اس کو عمر میں تم پر بھروسہ زمانی ہے۔ جائیں دونوں۔ مگر ایک اول
 ہے اور ایک جانی ہے۔ شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا
 ہے۔ طریقہ سیدانگنی سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں
 آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم خنود ہو گئے۔ من طبع خدا داد رکھتے
 ہو۔ ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو۔ اسم تاریخی کیوں نہ
 نکالو۔ کہ مجھ پر ظم زدہ، دل مردہ کو تکلیف دو۔ علاء الدین خان ا
 تیری جان کی قسم، میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی ظم کر دیا اور
 لڑکا نہ جپا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے میری خوشحال طالع کی
 تاثیر تھی۔ میرا ممدوح بیٹا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور احمد علی شاہ
 ایک ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے
 متحمل ہوئے پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس میں
 قصیدے کہے گئے۔ وہ عدم سے بھی پرے جا پہنچا۔ صاحب، وہائی
 خدا کی! میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا نہ نام تاریخی
 وصولوں گا۔^{۵۷}

غلی شیونرائں آرام نے مرزا سے تاریخ کہنے کی فرمائش کی۔ اس کے جواب میں مرزا کہتے ہیں:

کل آپ کا خط آیا۔ رات بھر میں نے خون جگر کھایا۔ ۲۱ شعر کا قصیدہ کہہ کر تمہارا حکم بجا لایا۔ میرے دوست، خصوصاً مرزا تقی، جانتے ہیں کہ فنی تاریخ کو نہیں جانتا۔ اس قصیدے میں ایک روش خاص سے اکتھار ۱۸۵۸ء کا کردیا ہے۔ خدا کرے، تمہارے پسند آوے۔ تم خود قدردانِ سخن اور تین استاد اس فن کے تمہارے یار ہیں۔ میری محنت کی داوہل جائے گی۔ ۶۷

۱۲۷۳ھ میں مرزا کے ایک دوست کے بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ اس نے مرزا سے تاریخ کہنے کی فرمائش کی۔ چوں کہ میرزا اس فن کے داؤں بیچ کو مشکل سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے میرزا تقی کو خط لکھا کہ وہ اس لڑکے کی تاریخ وقات ایک مثنوی میں لکھ دیں۔ چنانچہ روز جمعہ ۳۰ اپریل ۱۸۵۸ء کو تقی کے نام لکھتے ہیں:

ایک امر ضروری باعث اس تحریر کا ہے کہ جو میں اس وقت روانہ کرتا ہوں۔ ایک میرا دوست اور تمہارا ہمدرد ہے۔ اس نے اپنے حقیقی بھتیجے کو چنا کر لیا تھا۔ اظہارہ انیس برس کی عمر، قوم کا کھتری، خواہصورت، وضعدار، نوجوان ۱۲۷۳ھ میں بیمار پڑ کر مر گیا۔ اب اس کا باپ مجھ سے آرزو کرتا ہے کہ میں ایک تاریخ اس کے مرنے کی لکھوں۔ ایسی کہ وہ تاریخ نہ ہو، بلکہ مرثیہ ہو کہ وہ اس کو پڑھ پڑھ کر رویا کرے۔ سو بھائی اس سائل کی خاطر مجھ کو عزیز اور فکرِ شعر متروک۔ مع پڑا یہ واقعہ تمہارے حسب حال ہے۔ جو غریب کاں شعر تم لکھو گے وہ مجھ سے کہاں نکلیں گے۔ بطریق مثنوی میں تمیں شعر لکھ دو۔ مصرع کے آخر میں ملاء تاریخ ڈال دو۔ نام اس کا برعکس تھا اور اس کو ”ہایو، ہایو“ کہتے تھے۔ چنانچہ

میں بحر ہرج مسدس خیموں میں ایک شعر تم کو لکھتا ہوں۔ چاہو
اس کو آواز میں رہنے دو اور آئندہ اسی بحر میں اشعار لکھ لو۔ چاہو
کوئی اور طرح نکال لو۔ لیکن یہ خیال رہے کہ سائل کو متوٹی کے
نام کا درج ہونا منظور ہے اور "بابو برہمچاری" سوائے اس بحر کے
یا بحر دہل کے اور بحر میں نہیں آسکتا۔ وہ شعر میرا یہ ہے:

برم چوں نام بابو ہرج موبہن

چکد خون دل ریش از لب من^{۸۵}

مذکورہ بالا اقتباسات سے واضح ہو جاتا ہے کہ فن تاریخ گوئی میں مردا
خصوص اور واضح نظریات رکھتے تھے۔ انھوں نے غزل کی طرح روٹاں عام سے ہٹ کر
تاریخیں کہی ہیں۔ اور یہ عادت انہی کی ایجاد ہے۔ یہ تاریخیں ان کی جدت طرازی اور
طبیعت کی دشوار پسندی سے ہم آہنگ تھیں۔ ان کی طبیعت معمولی تاریخیں کہنے کی متحمل
نہیں تھی۔ ذیل کی تاریخیں ملاحظہ ہوں:

تاریخ وفات مولانا فضل امام

(والد مولانا فضل حق خیر آبادی)

اے دریا قدوہ ارباب فضل
کرد سوے چند الماویٰ غرام
کار آگاہی ز بہکار اوقاد
محنت دارالملک مستی بے نظام
چوں ارادت از پے کسب شرف
ہست سال فوت آں عالی مقام
چہرہ ہستی خراشیدم نصرت
تا ہائے تخریج کردم غم

کفتم احمد "سایہ لطیف مجا"
 یاد آرمشک "مفضل امام"
 ۹۹۲+۲۵۷-۵=۱۲۴۳ ہجری

تاریخ تعمیر امام بازہ سراج الدین علی خان

چوں شد بسمن مدفن خاں بزرگوار
 طرح امام بازہ عالی سپر سا
 رضواں ز غلد نور براں بام و در فطامہ
 تا گشت سنگ و تخت چو آئینہ زلفا
 رحمت چہ بساط وراں بزم تقویت
 آورد اظہار سے از سایہ تا
 رقم نیازمند بہ پیش سرور فیض
 کفتم کہ پردہ از زرخ تاریخ برکشا
 ہ "تقویت سرائے" بزو "نار" و بکشت
 لطف ساز فکر تاریخ ایں بنا
 ۱۱۵۸+۸۶=۱۲۴۴ ہجری

تاریخ کتھنی نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ

(۲۵ شعر)

شاہ عالم نصیر دیا کہ بود
 دولتش اکین از گزیر دوال
 بطراز رقم سلیمان ہوا
 بہ نظام اثر ہمایوں قال

بعد ازاں رفت آنجا بھر
آنکھ در گفتار غالب نام یافت
قطعہ تاریخ آں فرخ بنا
ہم در آنجا صورت ارقام یافت
شت پا چو راحت و آرام بخش
ہر دو را در گوشہ حمام یافت

یہ حمام احرام الدولہ حکیم اللہ خاں نے اپنی حویلی کے احاطے میں بنوایا تھا جو دہلی میں لال کنویں سے انجیری دروازے تک پھیلی ہوئی تھی۔ حمام ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱-۵۲ء) میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس قطعہ تاریخ میں ”گوشہ حمام“ کے اعداد ۳۲۰ میں ”راحت“ کے اعداد ۶۰۹، اور ”آرام“ کے ۲۳۲ کا تہیہ اور تقریباً ”شت“ لفظ ”پا“ کے اعداد ۳ کا تخرجہ ہے جس سے سال تقیر ۱۲۶۸ھ حاصل ہوتا ہے۔

قطعہ تاریخ وفات بانوے شاہ اودھ

در ہزار و دوصد و شصت و شش از نیا گذشت
بانوے شاہ اودھ مریم مکانی نام او
آنکھ چوں بالائے بام کاخ شہسودے خویش
آپ ضیاء رخنے از نادوانی بام او
منزل ہم بر کمال حسن او آمد وکیل
چوں مہ کمال بدر از نور نہ شد جام او
در نور و درہر دے شد سامرہ ہر منزل کش
خود اساسی آں زمیں بود از پے آرام او
گفت غالب سال فراق لیکن از دے نیاز
بانو با بیت رسول ہاشمی انجام او

قطعہ تاریخ تعمیر چاہ

میر سعادت علی کرد در اجیر طرح
 مسجد و چاہے کہ هست چشمِ آبِ جا
 دانکہ ز باقر علی تا بہ طغی ی رسد
 حلقہ حلقہ بجم سلسلہ اش مرزا
 ساختہ شد چون مکان کرد بدل اجرِ آں
 از رو صدق و صفا نذر رسولِ خدا
 از پہ ایں سال نیک گفت تا ایں سرودش

چشمہ زحرم صفت مسجد کعب بنا

میر سعادت علی دہلوی نے اجیر میں ایک مسجد اور اس سے متصل ایک کنواں

۱۲۶۹ ہجری مطابق ۱۸۵۲ء میں بنوایا تھا۔

قطعہ تاریخ ولادت فرزند فتح الملک

با خود کفتم ہر فرزاند فتح الملک را
 خود چہ گویم، گفت غر دودہ آدم کیو
 کفتم از را لونہا لے رستہ در بارخِ مراد
 کفتم شش سرد روانِ گلشنِ عالم کیو
 کفتم از خوبیِ رخشِ ماتا بخشیدست، گفت
 سال ایں فرخِ ولادتِ خیرِ اعظم کیو
 کفتمش دیکر چہ کوئی؟ دیر لبِ خدیوہ گفت
 ہاے زایہ باجہ آگندہ از "کیو" ایں ہم کیو

فتح الملک یعنی مرزا غلام قمر الدین عرف مرزا قزاق ولی عہد بہادر شاہ ظفر۔ قزاق

کے یہاں شاہزادہ خود شید عالم کی ولادت اس قطعے کے ملاء تاریخ کے مطابق ۱۲۶۹ھ

(۵۳-۱۸۵۲ء) میں ہوئی۔ ”تجربہ اعظم“ کے اعداد ۱۲۷۱ ہیں جن میں سے حرف ”ب“ کے دو عدد اگلے شعر کے مطابق خارج کر کے ۱۲۶۹ حاصل ہوتے ہیں۔ اس تجربے میں نظم یا کم میں سے کم ابہام ضرور ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حرف ”ب“ کے تجربے نے بعد ”کو“ کے ”۲۶“ عدد ”تجربہ اعظم“ کے اعداد ”۱۲۷۱“ میں جوڑے جائیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ”تجربہ اعظم“ کے اعداد سے ”ب“ کے اعداد کا تجربہ مقصود ہے۔

قطبہ در تاریخ تعمیر در

نہادہ بنا احسن اللہ خاں
سر رہ پداناں در دل کشا
کہ غالب پہ سال فقیر او
رقم زو در دل کشا جدا

حکیم احسن اللہ خاں دہلوی نے ”در دل کشا“ دروازہ ۱۲۷۰ ہجری میں بنوایا۔ یہ دروازہ اس سڑک پر ہے جو حوض قاضی سے لال کوتوں اور مسجد فتح پوری کی طرف جاتی ہے۔ اور اس مکان کا دروازہ ہے جو حویلی بدل بیک خاں کا ایک حصہ تھا جسے بعد میں حکیم صاحب نے خرید لیا تھا۔

قطبہ تاریخ وفات مائے بیچ مل

کوچہ مائے بیچ مل شیریں کلام مرد
دیرینہ دوست رفت ازیں شکلا در بیچ
کفعم کے ز سال دفاتش نکلاں وہ
غالب شنید و گفت چہ گویم ”مبدا در بیچ“

مائے بیچ مل کھتری، خواہر شکلا جوہر اور میرا شکلا درد کے باپ، غالب کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ جوہر کے نام ”بارغ دو در“ کے ایک قادی خط میں غالب نے کہا ہے، ”بیچ مل میرے دیرینہ دوست ہیں۔ ہر دفعہ دو مہینہ دھرمیرے پاس آتے ہیں اور بہت بیٹھتے ہیں۔ میرے ان کے درمیان اگر کوئی جھگڑا تھا تو قمار بازی میں تھا

مرزا غالب کی تاریخ کوئی

اور اب وہ بساطِ انھ کی توجہ ہی محبت ہے، کوئی نزاع نہیں۔ ان کا انتقال ۱۲۷۷ھ میں ہوا۔ ”یہا درلج“ ماڈ تاریخ ہے۔

قطعہ تاریخ کامیابی سید غلام بابا خاں

فتح سید غلام بابا خاں

خود نشان دوام اقبالست

ہم ازیں رو بود کہ غالب گفت

کہ ظفر نامہ ابہ سالت

یہ قطعہ غالب نے نواب میر غلام بابا خاں بہادر سوہتی کی ایک مقلد سے میں کامیابی کا حال بھیجی کے ایک اخبار میں چڑھ کر نظم کیا تھا۔ ”ظفر نامہ ابہ“ ماڈ تاریخ ہے جس سے سال ۱۲۸۳ھ حاصل ہوتا ہے۔

قطعہ تاریخ وقایع ناظر وحید الدین

کرد چہ ناظر وحید الدین ز دنیا انتقال

گفتم، آیا بر کدام آئیں بود سال وقایع

گفت غالب کز سر زاری اگر تا پیش برسد

خود ہمیں ”ناظر وحید الدین“ بود سال وقایع

ناظر وحید الدین سے مراد ہیں سرسید کے بڑے ماموں نواب مختار الدولہ وحید الدین احمد خاں بہادر جو نواب دہلیہ الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ وزیر اکبر شاہ جانی کے خلیفہ اکبر تھے اور مرزا جہاں گیر کے بیٹے تیمور شاہ کی سرکار میں مختار تھے۔ وحید الدین احمد کے بھائے صرف وحید الدین بھی کہہ سکتے ہیں۔ ماڈ تاریخ میں ”ناظر وحید الدین“ کے اعداد ۱۲۷۴ سے ”سر زاری“ یعنی ”سو“ کے ۷ عدد کا تخریج جس کا قرینہ ہے ”بزم“ اس طرح سال وقایع ۱۲۶۷ھ حاصل ہوتا ہے۔

قطعہ تاریخ ولادت فرزند کے

اعزاز اسم و سال مولود
معلوم کن از بخشہ فرزند
چوں یک صد و بست و چار ماہ
انست شمار عمر دل بند

یہ سورت کے نواب سید ابراہیم علی خاں دقا کے فرزند ارشاد حسین خاں کی ولادت کا قطعہ تاریخ ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ۱۲۸۵ھ ہے۔ جب ”بخشہ فرزند“ کے اعداد ۱۳۰۹ کے اعداد میں سے ۱۲۸۵ لیے جائیں تو ۱۲۳ بنتے ہیں۔

تاریخ اختتام گلشن بختار

غالب ایں رنگیں کتاب ”گلشن بختار“ نام
زدکش بخت تیری گنجا الانہار ہست
گر کے لب کھو تاریخ اتمامش بود
”جوے ہائے آب“ ہم در گلشن بختار ہست

”جوے ہائے آب“ کے ۳۸، گلشن بختار کے ۱۲۱۳ کے ساتھ جمع کر کے ۱۲۵۱

نکلتے ہیں۔

تاریخ وفات ذوق

کوئید رفت ذوق ز دنیا، ستم بود
کاں گوہر گراں بہ نہ نشت و گل نہند
تاریخ فوت شیخ بود ”ذوق جنتی“
بر قول من رواست کہ احباب دل نہند

۱۲۶۹+۲=۱۲۷۱ھ

تاریخ وفات میر حسن ابن علی ☆۱۰

حسین ابن علی آمودے علم و عمل
کہ سیداعلمائے کش خورش بودے
نمائے دماغے اگر بودے بیچ سال دگر
”مہم حسین علی“ سال ہمش بودے

۱۲۷۸-۵ = ۱۲۷۳ = ہجری

تاریخ غدر

چوں کرد سپاہ بند در بند
با انگلیاں ستر بے جا
تاریخ وقوع ایہی واقع
واقع شدہ ”زحقیچہ بے جا“

۱۲۷۷-۳ = ۱۲۷۳ = ہجری

تاریخ وفات نواب میر جعفر ☆☆ علی خان بہادر ☆۱۱

گردید نہاں سر جہاں تاب درخ
شد تیرہ جہاں چشم احباب درخ
ایہی واقعہ را از روی قاری غالب
تاریخ رقم کرد کہ ”نواب درخ“

۱۲۷۷-۱۲۸۰ = ۱۲۷۳ = ہجری

تاریخ ولادت ارشاد حسین خاں پسر سید ایما جیم علی خاں ☆۱۲

زبانی

حق داد بہ سید ز پیو انعام
فرخ پرے کہ واجب است اکرام

تاریخ ولادت یوں کم و بیش
 "ارشاد حسین خان" کہ باشد بیش
 ۱۲۸۵ ہجری

تاریخ ولادت فرزند ارجمند بخاتہ

نواب میر غلام بابا خان بہادر

میر بابا یافت فرزندے کہ ماو چارہ
 بر فراز لوح گردوں گردۂ تیشال اوست
 فرشی بنی و یابی بہرہ از تاز و طرب
 از سر تاز و طرب "فرزند فرخ" سال اوست
 ۱۲۳۱ + ۹ + ۵۰ = ۱۲۸۰ ہجری

تاریخ کھدائی میرزا جعفر

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی
 ہوا بزم طرب میں رقص ناہید
 کہا غالب سے، تاریخ اس کی کیا ہے
تو بولا "اشرح جشن جمشید"
 ۱۲۸۰ ہجری

ایشا

جنت انجمن طوسے میرزا جعفر
 کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محفوظ
 ہوئی ہے ایسے ہی فرشتہ سال میں غالب
 نہ کیوں ہو ملاۂ سال عیسوی "محفوظ"
 ۱۸۵۳ ہجری

ایک

پورا دو فرزند احمد کو ملا ہے
 رحمت باری کا جو گنجینہ ہے
 سال تاریخ ولادت یوں لکھا
 ”راحت جاں ہے سرور سینہ ہے“
 تاریخ طبابت تذکرہ سراپا سخن
 اس کتاب طرب نصاب نے جب
 آب و تاب اطباء کی پائی
 فکر تاریخ سال میں مجھ کو
 ایک صورت حق نظر آئی
 ہند سے پہلے سات سات کے دو
 دیے ناگاہ مجھ کو دکھائی
 اور پھر ہندسہ تھا پارہ کا
 با ہزاروں ہزار زیبائی
 سال ہجری تو ہو گیا معلوم
 ہے شمول مہارت آرائی
 مگر اب ذوق بذلہ نئی کو
 ہے ہدا گاہ کارفرمائی
 سات اور سات ہوتے ہیں چودہ
 یہ اسو سعادت افزائی
 فرض اس سے ہیں چارہ محسوم
 جن سے ہے چشم و جاں کو زیبائی

اور بارہ نام ہیں بارہ
جن سے ایمان کو ہے توانائی
ان کو غالب یہ سال اچھا ہے
جو آخر کے ہیں قلابی ۱۳۵۶
۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶

قلم تاریخ اختتام "مکتوب حکمت" ۱۳۵۶

سلیم خاں کہ وہ ہے نور چشم واصل خاں
عکیم حادق و دانہ ہے وہ لیلیٰ کلام
تمام دہر میں اس کے مطلب کا چرچا ہے
کسی کو یاد بھی لقمان کا نہیں ہے نام
اسے فضائل علم و ہنر کی افرائیں
ہوئی ہے مبدعِ عالم سے اس قدر انعام
کہ عجیب علم میں اطفال ابجدی اس کے
ہزار بار غلاطوں کو دے چکے الزام
عجیب نسخہ تیار کیا ہے ایک اس نے
کہ جس میں حکمت و طب ہی کے مسئلے ہیں تمام
نہیں کتاب ہے، اک منبع نکات بدیع
نہیں کتاب ہے اک معدن جواہر کام
کل اس کتاب کے سال تمام میں جو مجھے
کمال فکر میں دیکھا، خود نے بے آرام
کہا یہ جلد کر ٹو اس میں سوچنا کیا ہے
"لکھا ہے نسخہ حق" بھی ہے سال تمام

قطرۂ تاریخ وقات مستیر الدولہ محبوب علی خاں

چوں مستیر الدولہ ہاں سیرت خوب

مستقی مُرد و شد ہمارا از ذلّوب

محبوب علی خاں بچھاں امش بود

تاریخ وقات شد، "دریغاً محبوب"

۱۲۷۳ ہجری

۱۵۷۵
قطرۂ

ہر شب بقدح رختے بارۂ گلغام
آرے ز دو سی سال مرا قاعدہ ایں بود
شش روز شد، ایک کہ بے دستم نیست
شد غزوہ تر دل کہ ازیں پیش حزی بود
اشب چہ سراپم کہ شب ازل گور است
شش روز پہ چٹائی و کوارے جہیں بود
ناگاہ دو آن وقت کہ دو قلعہ رو مر
از من دو قدم تا بدم باز پیمیں بود
یک رہ دو تن از شرب میم مع نوشہ
ہاں مع نہ از جنس، بل از غیرت دیں بود
ہر چند ہاں مع، من از سے گلزشم
لنا دم کیراے عزیزاں پہ کہیں بود
دانی کہ چہ شد؟ شد در سوداگر صہیا
کش داد و شد با من دہانہ نہیں بود
گذشت ز اعزاء بالیست، بہن گفت
دیکر عدم بادہ کہ معمول نہ ایں بود

با کاسے خالی چہ کند کیسے خالی
 تاخواستہ در خواستہ دل صبر گزریں بود
 گر زور بود از جاے دیگر می طلبیدم
 کو نقد دریاں دست کہ پشتم بزمیں بود
 در غم شعبان چہ ز من باوہ گرھہ
 خود "غالب" پڑمردہ" نکستی ز شمس بود
 بد شش پدر آ از مہ شعبان کہ دریں چا
 مقصود من از تخریج المکتب ہمیں بود
 ۱۲۹۱ - ۶ = ۱۲۸۵ھ

حوالے اور حواشی

- ۱۵۱ "مکتبہ" کے اعداد ۹۱۱ نہیں بلکہ ۹۳۲ لکھے ہیں۔
 ۱۵۲ "مکتبہ" مطبعہ: "مس ۳۵-۳۳، حصہ دوم۔
 ۱۵۳ "مکتبہ" مطبعہ: "مس ۸۵، حصہ اول، مطبعہ کجھالی، دہلی، ۱۸۹۹ء۔
 ۱۵۴ میرزا یوسف بیگ: غالب کے چھوٹے بھائی تھے۔ بھتیجی غالبہ، وہ بھی بری تک دیوانہ رہے اور
 آخر کار ۲۹ ستمبر ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو انکسار کیا۔ لیکن انہیں سمن خاں ("نقد کی تاج و شامہ"
 ص ۸۸) لکھتے ہیں کہ میرزا یوسف خاں جو دہلی دار سے جالندہ میں تھے۔ گولیاں کی آواز سن کر
 ناپاک ہاتھ لگے اور مارے گئے۔ مرزا نے تاریخ مکتبہ:

د سالہ مرگہ ستم دیدہ میرزا یوسف
 کہ رہیے نہ جہاں در ز غولیں بچاؤ
 کیے وہ انجمن لائسنس میں پڑھیں کہ
 کلچر "آپے" و کلچر "مکتبہ دیوانہ"
 ۱۲۹۰-۱۲۹۱ھ

- ۱۵۵ "مکتبہ" مطبعہ: "مس ۳۲۔
 ۱۵۶ "مکتبہ" غالب: "جلد اول مس ۳۲۳۔
 ۱۵۷ اہلہ، مس ۳۲۳

۸۵۷ "مردے مٹے": مس ۱۱۷۷ حصہ اول۔

۹۵۷ ساروہ جلدات سے تقریباً ۵۰۰ میل کے واسطے پہ درپائے دہلہ کے مشرقی کنارے چھوٹا سا قریہ ہے۔ یہاں حضرت علی نقی اور جناب زینب خاتون زینہ امام حسین عسکری، جناب حلیہ خاتون ظہیر امام علی نقی کے حرار ہیں اور وہ جنت الشرف بھی ہے جس میں ان بزرگوں کا قیام تھا۔ قبیلے میں مریم مکانی سے مراد بادشاہ نکم زینہ خاتون الدین عیسیٰ عیسیٰ سے ہے۔ ان کا انتقال ۱۲۶۶ء میں ہوا تھا۔ ("تاریخ اودھ"، جلد چہارم، ص ۳۲۹ میں ۱۲۶۳ ہجری درج ہے)۔

۱۰۵۷ میر حسین انہی علی، غلام باب مولوی سید ولداد علی کے گھر ۳۳ راجہ اٹالی ۱۲۷۱ء (اکتوبر ۱۷۹۶ء) کو ولادت ہوئی۔ "غورچند کمال" ۱۲۸۱ء تاریخ ہے۔ مشرق طوم غلام باب اور اپنے بڑے بھائی سید محمد سلطان اہلسا سے حاصل کیے۔ ۱۷۱۲ء ص ۱۲۷۳ء (اکتوبر ۱۸۵۶ء) کو انتقال کیا۔ غالب نواب انور الدولہ سوادہ میں خاں شفیق کو کہتے ہیں:

آپ کو معلوم ہوگا کہ میرن صاحب نے انتقال کیا۔ یہ پھر لے بھائی تھے
بھتیجا ناصر (سلطان اہلسا) کے۔ نام ان کا سید حسین اور خطاب
سید اہلسا۔ "مفتی گئی میر حسین ان علی" میں نے رحلت کی تاریخ پائی۔
اس میں پانچ بدستے ہیں۔ یعنی ۱۲۷۸ ہوتے تھے۔ تخریج نئی روش کا
میرے خیال میں آیا۔ میں تو جانتا ہوں، اچھا ہے۔ دیکھو۔ آپ پر
فرماتے ہیں، کہ نہیں۔ "مردے مٹے": مس ۳۲۷

تقدیر تاریخ کے علاوہ غالب نے ایک دہ انگیز ترکیب بد قاری میں لکھا جو کلیات غالب میں موجود ہے۔
۱۱۵۷ نواب میر جعفر کے بارے میں مرزا ایک خط میں نواب میر نظام بابا خان بہادر کو ۲۱ راجہ اول
۱۲۸۰ء کو کہتے ہیں:

ہے نواب میر جعفر علی خاں جیسا امیر روشن گھر نام اور بد شکاں ایمان
بہرہ انگیزتہ دلیہ بھائی یعنی ۳۶ برس کی عمر میں ہیں میرا بے: "نکل
میں سرور کی آواز دہا ہے۔" کج تو ہیں ہے کہ یہ دیر آشوب تم ہے۔
جموع اہل بد نام دار و سواد ہوں تو بھی تم ہے۔ اگرچہ میں کیا اور
میری دعا کیا۔ مگر اس کے سوا کہ مطریت کی دعا کروں اور کیا کروں؟
تقدیر سالی رحلت نواب شہزادہ کتب۔ از مدے "کدائی" ذائے ہند
کے ہند بدستے جا بھی تو ۱۲۸۰ء پیدا ہوتے ہیں۔ "مردے مٹے":
ص ۱۵۷، حصہ اول

۱۲۵۷ مرزا ایک خط میں نواب سید ابراہیم علی خاں کو کہتے ہیں:

اور بدنگی سرور میں ہے۔ حضرت سید احمد حسین خاں صاحب بدنگھو اہلسا
کی قزلبے سے معلوم ہوا کہ آپ کے گھر مولود مسعود پیدا ہوا۔ ایک مہارت
دیکھی، مگر آپ کے اصل اہلسا میں میں نے پہچانی ہے اور ایک رہائی
اور ایک تقدیر اپنا اور ایک تقدیر سید صاحب ممدوح کا جو انہوں نے یہاں
بچا تھا وہ بھی پہچانیا اور میں قبیلہ بدنگھو پہچانی لال محکم اور میر جعفر

انہی کے حکم مطبع نے جو یہاں تاریخیں لکھی تھیں، وہ چھپا دیے۔ چنانچہ اپنی لکھی ہوئی رہائی اور قصہ عرض کرتا ہوں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ۱۸۸۵ء ہے۔ جب ”جنت فرشتہ“ کے اعداد میں سے ۱۸۸۵ لے لے کر ۱۸۸۴ بچے ہیں۔ ان کو میں نے دہائے مرقومہ قرار دیا۔ (مرکوزے ملتے)۔

”کامل الاخبار“ دہلی میں ”جہنیت“ کے عنوان کے تحت یہ مہارت موجود ہے:

محصل الہی ۲۶ ربیع الثانی ۱۲۸۵ء روز یک شنبہ گھنٹا بھر دن رہے۔
جنت ملتے القاب نواب میرزا ابوالہجیم خاں بہادر دہلی، اعظم سورت کے گمرچا بیٹا ہوا۔ گویا نواب صاحب چاند تھے اور یہ چاند کے پاس ایک دھن ستارہ چمکا۔ حق بہادری خانی اس ماہ رشیدہ اور اختر تابندہ کو اربع عزت و اقبال پر تا طوراً آفتاب قیامت پر نور دنیا کسفر رکھے۔
جنت مستطاب نجم الدور نواب اسد اللہ خاں بہادر غالب دہلی نے ایک رہائی اور ایک قطعہ جہنیت ہی طرز کا، کہ دیکھنے والے شرم و دہمیدہ اس کا لطف اٹھا نہیں سکے، ارشاد فرمایا ہے۔ ہم یہ ہنوا نہیں رہیں
اخبار وہ رہائی و قطعہ لکھتے ہیں۔

(”کامل الاخبار“، دہلی، مؤرخہ ۲۴ جنوری ۱۸۶۸ء)

۱۳۵۱۔ یہ اشعار ”تذکرہ مرزا فتح“ صفحہ ۲۸۲ پر ”قطعہ تاریخ میرزا اسد اللہ خاں صاحب دہلی“ کے عنوان کے تحت درج ہیں۔ ”مرزا فتح“ کے مؤلف سید حسن علی حسن ہیں۔ وہ سید شاہ حسین جہنیت کے بیٹے سید عرب شاہ کے پوتے اور سید میرک شاہ کے پر پوتے تھے۔ حسن کے اجداد خواست نوری خور (افغانستان) سے فرخ میرک طلب پر لاہور آئے تھے۔ حسن کے والد آٹھ کتابوں کے مصنف تھے۔ حسن نے ”مرزا فتح“ عام اور مزید قاری اور اردو تذکروں سے ہٹ کر لکھا ہے۔ یعنی اس میں شعرا کے حالات زندگی اور موت کا کام درج نہیں کیا گیا بلکہ قدامت سے لے کر اپنے معاصرین تک سات ۳۰ سے زائد شعرا کی ایسی فہرستیں دی گئی ہیں جو سر سے لے کر کتابوں تک مختلف اصناف پر لکھی گئی ہیں۔ حسن نے یہ تذکرہ شیخ ابی بکر علی کی فرمائش سے عرب کیا اور ۱۲۹۷ھ میں تمام کیا۔ تذکرہ کئی بار ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۱ء) میں مطبع فکھور راج محل رکاب گنج لکھنؤ سے ۳۰۲ سطحوں میں شائع ہوا تھا۔ اب یہ نہایت نادر ہے۔ مرزا کا ذکر سید سلیمان حسین نے اس کی تجلی کی تھی وہ بھی اب کیا ہے۔ حسن کا انتقال ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) سے قبل ہوا۔ (”مجموعہ فتح“ ص ۳۴)

۱۳۵۲۔ یہ قصہ حکیم مرزا سلیم خاں بن مرزا حکیم خاں بن مرزا علی خاں دہلی کی کتاب موسم بہ ”تکلیف نکست“ کے اختتام کی تاریخ ہے۔ اس کے ۱۲۷۹ء سے ۱۲۸۳ء کے اعداد ملتے ہیں۔ کتاب کئی بار ۱۲۸۵ء (مارچ ۱۸۶۹ء) میں اور دوسری بار جولائی ۱۸۸۵ء میں مطبع فکھور سے چھپی تھی۔

۱۳۵۳۔ اس قطعے کے بارے میں دو باتیں مابقی ”بارہ دود“ حذ: ”محقق تار“ (۱۹۰۳ء) میں لکھتے ہیں:

یہ قصہ دائم المعروف نے رسالہ ”آج کل“ دہلی شہر

۱۵ مئی ۱۲۷۷ء میں ایک قادیانی بادشاہ کے ساتھ

شائع کیا تھا جس کی بار نوشتہ ذیل میں درج کی

جاتی ہے۔ اس قمر کے حسن کا معاشی میں کئی تبدیلی

نہیں کی گئی ہے:

غالب نے ترک شراب کی کئی دفعہ کوشش کی، مگر یہ قہر توئی رہی، کبھی روز اور میں، کبھی شب بامشب میں، کبھی ہوش میں کبھی ہوش کی حالت میں، کبھی صبح کی صبحوں کی خاطر، کبھی اک گود بے غودی کی غرض سے، کبھی دوسری اصحاب کاظم ملا کرنے کے لیے۔ کبھی غم کھنک کو گوارا جانے کے لیے۔ چنانچہ اس طرح عوام کو اس کے حواس ضمیر نے خود جان کیا ہے:

یک روز چ ترک باد کوئی غالب
دش روز دگر بہ باد شوی غالب
دن قہر ہے چہ چہ بوجی غالب
قہر شب قہر است کوئی غالب

(یہ رباعی حلقہ غالب کلمات فارسی، قلمی، سالہ کتابت، ۱۸۶۶ء، کتب خانہ رام پور میں محفوظ ہے۔)

مگر کچھ شہان ۱۳۸۵ھ (سرخسہ ۱۶ نومبر ۱۸۶۸ء) کی قہر جس کو اس نے خود اپنی نصیحت دی کہ ایک قلم کے کامیاب پر پیر ہے اس قہر کی تاریخ کی، یقیناً تا دم مرگ قائم رہی ہوگی۔ یہ اس کی آخری طاعت کا زمانہ تھا اور اکثر یہ شعر روزِ زبان رہتا تھا:

دم جانکشیں بہ سر داد ہے
مزاج دا اب قلہ ہی قلہ ہے

یہ قصہ تاریخ غالب نے سرخسہ کچھ شہان ۱۳۸۵ھ (مطابق شب است دوم نومبر ۱۸۶۸ء) کو نظم کیا تھا۔ یہ مضمون صرف اس لیے اہم ہے کہ غالب کی زندگی کے ایک انقلابی نقطہ کا پتا دیتا ہے۔ بلکہ اس لیے بھی اہم ہے کہ نظم میں اس صمیم شاعری یہ آخری نکاش ہے۔ اس کے بعد کی کوئی نکاش ۱۸۶۷ء نظم میں نہیں۔ اس قصے کا مائل ”نہد بارغِ دود“ ہے جو غالب کی فارسی نظم و نثر کے بعد انھیں نے بہ مشکل ہے۔ میرے پاس اس مجموعے کا اصل نسخہ ہے جس کی کتابت مہارست کی غرض سے مصنف کی زندگی میں ۱۳۸۳ھ (مطابق ۱۸۶۶ء-۱۸۶۷ء) میں شروع ہوئی تھی اور مصنف کی وفات کے ایک سال چار مہینے انھیں دی بعد ۱۸۶۷ء (۱۳۸۵ھ) میں شروع ہوئی تھی۔ مگر اس مجموعے کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔

”نہد بارغِ دود“ غالب کا دیکھا ہوا تاریخی نام ہے جس سے آغاز کتابت کا سال ۱۳۸۳ھ حاصل ہوتا ہے، جیسا کہ تاریخ کی مہارست میں درج ہے۔ کاتب نے یہ نسخہ غالب کے شاگرد شفیق میرا نگر کھتری کی فرمائش پر لکھا تھا۔ یہ شفیق میرا نگر حلیہ کاغذی کے قریب گھڑی گئی میں رہے تھے۔ نسخے میں بعض اشکارات سے قیاس ہوتا ہے کہ اس کا پیش حصہ غالب کی نظر سے گزرا تھا۔



☆ ☆ ☆ "کلمات غالب فارسی" (جلد اول)، مرشد سید مرتضیٰ حسین قاضی کھنوی، مجلس ادبی ادب، لاہور، طبع اول جون ۱۹۶۷ء، ۵۰۶ ص، میں اس قصے کا عنوان ہے: "تاریخ وفات نواب میر افضل خان" جو ظاہر غالب کی تھیں ہے۔ (ادوات)



غالب کے آخری ایام

مرزا غالب عرصہ دراز سے امراض مختلفہ کا مجموعہ تھے۔ آخری ایام میں وہ زندگی سے بیزار تھے اور اپنے کو مردوں میں شمار کرتے تھے۔ ہمیشہ کافور و کفن کی پڑی رہتی تھی۔^{۱۲۷} ۸ مئی ۱۸۴۷ء کو جب انھیں قمار بازی کی پاداش میں سزا ہوگئی تو اس وقت بھی عرصے سے طبل تھے اور سوائے پرہیزی غذا قلیہ چپاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے تھے۔^{۱۲۸} ۱۸۵۲ء کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵۵ برس کے سن میں وہ بہرے اور بوڑھے ہو گئے تھے، دانت گر گئے تھے، چہرے پر تھڑیاں اور ہاتھ میں ریشہ پڑ گیا تھا اور پادری رکاب تھے۔ انوارالدولہ شفیق کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

اکتوں کہ دامعناں فرد بخنت و گوش کراں گفت۔
موسے سپید است و روے پر آژنگ، دست بلرزہ اندرست و پائے در رکاب۔^{۱۲۹}

۱۸۵۵ء (۱۲۷۲ھ) میں ان کی یہ حالت تھی:

طاقت سلب، حواس مفقود اور امراض مستولی تھے۔^{۱۳۰}

۱۸۵۷ء (۱۲۷۳ھ) میں مرزا کا سامعہ مر گیا تھا، قوت ہاسرہ میں ضعف آ گیا

تھا اور بھتی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں وہ سب مختل تھیں۔ حواس سراسر مختل تھے۔

مرزا غالب کے آخری ایام

حافظ گویا بھی نہ تھا اور شعر کے فن سے گویا بھی مناسبت نہ تھی۔^{۹۵۸} ۱۸۵۸ء میں ان پر پہلی دفعہ قولنج کا دورہ پڑا تھا۔ اس بارے میں ۲۳ مئی ۱۸۵۸ء کو مرزا غالب کو اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

وہ خط پہلا تم کو بھیج چکا تھا کہ بیمار ہو گیا۔ بیمار کیا ہوا تو قح زیت کی نہ رہی۔ قولنج اور پھر کیسا شدید کہ پانچ پہر مرغان نیم ہسل کی طرح تڑپا کیا۔ آخر مصارفہ ریوند اور ادغی کا قتل پیا۔ اس وقت قونج گیا مگر قصہ قطع نہ ہوا۔ مختصر کہتا ہوں، میری غذا تم جانتے ہو کہ حدیثی میں کیا ہے۔ دس دن میں دوبار آدمی آدمی غذا کھائی۔ گویا دس دن میں ایک بار غذا تناول فرمائی۔ گلاب اور املی کا پتہ اور آلو بخارے کا افشردہ، اس پر دادر رہا۔ کل سے غریب مرگ گیا ہے اور صورت زیت کی نظر آئی ہے۔^{۹۵۹}

مرزا اپنے ضعف، ناتوانی اور پیری کے بارے میں ۳۱ دسمبر ۱۸۶۰ء کو میاں داو خاں سہاج کو لکھتے ہیں:

ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے کھانے کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کابل، گراں جانی، گرانی، رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے، بڑا سطر دور دراز درخشاں ہے۔ زاو راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں، اگر تاج سیدہ بخش دیا تو خیر، اور اگر باز پرس ہوئی تو سطر مقرر ہے اور ہاویہ زولایہ ہے۔ دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔^{۹۶۰} مرزا کی حالت ۱۸۶۳ء میں تشویش ناک تھی۔ لکھتے ہیں:

ایک برس سے عوارض فساد خون میں مبتلا تھا۔ بدن پھوڑوں کی کثرت سے سر و چہرے اور لالہ زار ہو گیا تھا اور یہ پھوڑے ایسے تھے جیسے انگارے سبکتے ہیں۔ طاقت مفلوہ ہو گئی تھی۔^{۹۶۱} جتنا خون تھا بے مبالغہ آدھا اس میں سے چھپ ہو کر نکل گیا۔^{۹۶۲}

پوسٹ سے ہڈیاں منواو، اعضا پر دس جگہ پھائے لگتے ہیں۔^{۱۰۶}
 غلام حسین قادر بکراہی^{۱۰۷} کو۔ شعبہ ۲۳ نومبر ۱۸۶۳ء کو لکھتے ہیں:
 برس دن صاحب فرش رہا ہوں۔ چھوٹے بڑے دھم پارہ اور ہر دھم
 ٹوں چکاں۔ ایک درجن پھائے لگ جاتے تھے۔ جسم میں ہوتا لہو
 تھا چھپ ہو کر نکل گیا۔ تھوڑا سا جو جگر میں باقی ہے وہ کھا کر بیٹا
 ہوں۔ کبھی کھاتا ہوں، کبھی چیتا ہوں۔ مرض کے آغاز میں سے
 اب بھی یہ نشان موجود ہے کہ دونوں پاؤں کی دو دو انگلیاں بیڑھی
 ہو گئی ہیں، مع ہڈا حوزم ہیں۔ جوتا نہیں پہنا جاتا۔ ضعف کا تو
 بیان ہو ہی نہیں سکتا۔^{۱۰۸}

مرزا علاء الدین خاں علائی کو لکھتے ہیں:

میری حقیقت سنو، مہینہ بھر سے زیادہ کا عرصہ ہوا۔ بائیں پاؤں
 میں دم، کوف پا سے پھٹ پا کو گھیرتا ہوا چنڈی تک آنا۔ کھڑا
 ہوتا ہوں تو چنڈی کی رگیں پیٹنے لگتی ہیں۔ خیر نہ اٹھا، روٹی کھانے
 محل سرا نہ گیا، کھانا نہیں منگایا، پیٹاب کو کیوں کرتا انھوں، حاجتی
 رکھ لی۔ بغیر اکڑو پیٹنے بات نہیں فٹی، پاخانے کو اگرچہ دوسرے
 تیسرے دن جاؤں، مگر جاؤں تو سکی۔ یہ سب موقع خیال میں
 لاکر سوچ کر لو کیا گزرتی ہوگی۔ آغاز فتن، حزیہ علیہ یا مستزاد:
 بڑی دھندلیب، چنیں گلتے اعد۔

اپنا یہ مصرع بار بار چپکے چپکے پڑھتا ہوں:

اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

مرگ اب ناگہانی کہاں رہی۔^{۱۰۹}

نواب انوار الدولہ فتنی کو دو شعبہ ۱۶ رمضان ۱۲۸۰ھ (مطابق ۱۵ فروری

۱۸۶۳ء) کو لکھتے ہیں:

سال گزشتہ مجھ پر بہت سخت گزرا۔ ۱۳، ۱۲ مہینے صاحب فرش رہا۔

البتہ دشوار تھا۔ چٹنا، پھرنا کیا۔ نہ چپ، نہ کھانسی، نہ اسہال، نہ
 قہقہ، نہ لغوہ۔ ان سب سے بدتر ایک صورت، بڑے کدورت، یعنی
 احتراق کا مرض۔ مختصر یہ کہ سر سے پاؤں تک ۱۲ پھوڑے، ہر پھوڑا
 ایک رخم، ہر رخم ایک غار، ہر روز بے مبالغہ ۱۲، ۱۳ پھائے اور پاؤ
 بھر مرہم دھکا، نو دس مہینے بے غور و بے آب رہا ہوں اور شب و
 روز بے تاب۔ راتیں یوں گزری ہیں کہ اگر کبھی آنکھ لگ گئی، دو
 گھڑی غافل رہا ہوں گا کہ ایک آدھ پھوڑے میں نہیں اٹھی۔
 جاگ اٹھا، تڑپا کیا، پھر سو گیا پھر ہوشیار ہو گیا۔ سال بھر میں سے
 تین تھن تھے دن یوں گزرے۔ پھر تخفیف ہونے لگی۔ دو تین مہینے
 میں لوٹ پوٹ کر اچھا ہو گیا۔ نئے سرہ روح غالب میں آئی۔ اہل
 نے میری سخت جانی کی قسم کھائی۔ اب اگرچہ صحت ہوئی، لیکن
 ناتواں اور ست ہوں۔ حواس کھو بیٹھا۔ حافظے کو رو بیٹھا۔ اگر الٹا
 ہوں تو اتنی دیر میں الٹتا ہوں کہ جتنی دیر میں ایک قد آدم
 دہرا دھٹے۔^{۱۳۵}

میر نظام بابا خاں نے ۱۸۶۶ء میں غالب کو بھیجی آنے کی دعوت دی تھی، لیکن
 وہ بھری، ضعف اور ناتوانی کے سبب وہاں نہ جاسکے۔ ایک خط میں ان کو لکھتے ہیں:
 پاؤں سے اچانچ، کانوں سے بہرا، ضعف بصریت، ضعف دماغ،
 ضعف دل، ضعف معدہ، ان سب ضعفوں پر ضعف طالع، کیوں کر
 قصہ سفر کروں۔ تین چار شبانہ روز قفس میں کس طرح بسر کروں۔
 کھٹے بھر میں دو پار پیٹاب کی حاجت ہوتی ہے۔ طاقت جسم
 میں، حالت جان میں نہیں۔ آٹا میرا سوت تک کسی صورت
 خیر اسکاں میں نہیں۔^{۱۳۶}

مر کے آخری تھے میں غالب کا ضعف نہایت کو پہنچ گیا تھا۔ دوشہ زور پر

تھا۔ قلم لڑکوں سے بنالیتے۔ بیانی زائل ہو چکی تھی اور حواس بھی مختل ہو گئے تھے۔^{۱۹۵}
اشعار کی اصلاح لیٹے لیٹے دیتے تھے۔ بعد میں جو اشعار اصلاح کے واسطے آتے تھے وہ
بکس میں دھرے رہتے تھے۔^{۱۹۶} نہ آنکھ کام کرتی تھی اور نہ ہاتھ ہی۔^{۱۹۷}

کوئی شغل نہیں تھا۔ کوئی اختلاط، کوئی جلد، کوئی مجمع پسند نہ تھا۔ کتاب، شعر،
جسم اور روح، سب سے نفرت اور روح سے نفرت تھی۔^{۱۹۸} سامنے کا یہ حال تھا کہ ایک
تختہ کاغذ مع دو اوت و قلم سامنے دھرا رہتا تھا۔ جو دوست آتے تھے پریش مزاج کے سوا
اور کچھ کہتا ہوتا تھا، لکھ دیتے تھے اور ان کی تحریر کا جواب زبانی دیتے تھے۔^{۱۹۹}

فشی حبیب اللہ خاں ڈکا کو ۱۰ شوال ۱۲۸۳ھ (۱۵ فروری ۱۸۶۷ء) کو
لکھتے ہیں:

سقا بھڑا اردو میں ترنہ چرخ ہے۔ میری جھڑ برس کی عمر
ہے۔ بس میں غرق ہوا۔ حافظہ گویا تھا ہی نہیں۔ ساموہ باطل
بہت دن سے تھا۔ رفتہ رفتہ وہ بھی حافظے کی مانند معدوم ہو گیا۔
اب مینا بھرے یہ حال ہے کہ جو دوست آتے ہیں رگی پریش
مزاج سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے وہ کاغذ پر لکھ دیتے ہیں۔ غذا
مفقود ہے۔ صبح کو قند اور شیر، بادام محشر، دوپہر کو گوشت کا پانی،
سرشام تلے ہوئے چار کباب، سوتے وقت پانچ روپے بھر شراب
اور اسی قدر گلاب۔ غرق ہوں، پرہیز ہوں، فاسق ہوں، رویہ
ہوں۔ یہ شعر میر تقی میر کا میرے حسب حال ہے:

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
الغرض نہ روپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم^{۲۰۰}

میاں داو خاں سیاح کو ۱۱ جون ۱۸۶۷ء کے خط میں اپنی ضعیفی اور بے بسی کا
تفصیل ان الفاظ میں کہتے ہیں:

بھائی! میرا حال اسی سے جانو کہ اب میں خط نہیں لکھ سکتا۔ آگے

لیئے لیئے لگتے تھا۔ اب روضہ و ضعب بھارت کے سبب سے وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ جب حال یہ ہے تو کبھو صاحب میں اشعار کو اصلاح کیوں کر دوں اور پھر اس موسم میں کہ سر کا بھیجا پکھلا جاتا ہے۔ دھوپ کے دیکھنے کی تاب نہیں۔ رات کو گھن میں سوتا ہوں۔ صبح کو وہ آدمی ہاتھوں پر لے کر دالان میں لے آتے ہیں۔ ایک کوٹھری ہے، اندھیری، اس میں ڈال دیتے ہیں۔ تمام دن اس گوشہ تاریک میں پڑا رہتا ہوں۔ شام کو پھر وہ آدمی بدستور لے جا کر پٹک پر گھن میں ڈال دیتے ہیں۔ اور کیا کہوں، کس کس کی فزائیں، یہ سب ایک جگہ دھری ہوئی ہیں۔ اگر کوئی دن زندگی اور ہے اور یہ گری خیر سے گزر گئی تو سب فزائوں کو دیکھوں گا۔^{۳۳۵}

حبیب اللہ خاں دکا کو ۱۲ شوال ۱۲۸۴ ہجری مطابق ۱۸۶۸ء لکھتے ہیں: میں کیا لکھوں۔ ہاتھ میں روضہ، انگلیاں کہنے میں نہیں۔ ایک آنکھ کی چٹائی ڈال۔ جب کوئی آجاتا ہے تو اس سے خطوط کا جواب لکھوا دیتا ہوں۔ مشہور ہے یہ بات کہ جو کوئی کسی عزیز کی فاتحہ دلاتا ہے، موتی کی روح کو اس کی بو بکثرت ہے۔ ایسے ہی میں سگھ لیتا ہوں نقاد کو۔ پہلے مقدار نقاد کی قولوں پر حصر تھی، اب ماشوں پر ہے۔ زندگی کی توقع آگے مسخوں پر تھی اب دنوں پر ہے۔ بھائی، اس میں کچھ مبالغہ نہیں ہے۔ بالکل میرا بھی حال ہے۔ اللہ داتا الہ رحمن۔^{۳۳۶}

چهار شعبہ ۱۶ اپریل ۱۸۶۸ء کو میر نظام بابا کو لکھتے ہیں: امراض جسمانی کا بیان اور اخلاص ہم دیکر کی شرح کے بعد ہجوم غم ہائے نہانی کا ذکر کیا کروں۔ جیسا ہو سیاہ چھا جاتا ہے یا نڈی دل آتا ہے۔^{۳۳۷}

دراصل مرزا کو کلکتے کے معزز مہتممین کی ناکامی نے اتنا مایوس اور ناامید کیا تھا کہ وہ اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لیے عاجز آچکے تھے اور دنیا کے آکام اور نیک دوستی نے انھیں اس قدر آن گھیرا تھا کہ انھوں نے مرنے سے تقریباً بیس سال قبل اپنی موت کی پیش گوئی ۱۲۷۷ھ کے لیے کی تھی۔ چنانچہ اس پیشبین گوئی کے بارے میں دو شنبہ ۱۲/ جنوری ۱۸۵۹ء کو خواب غلام غوث بے خبرؒ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

اب اس سے زیادہ یاس کیا ہوگی کہ بہ نسیب مرگ جیتا ہوں۔ اس راہ سے کچھ مستغنی ہوتا چلا ہوں۔ دو ڈھائی برس کی زندگی اور ہے۔ ہر طرح گزر جائے گی۔ جانتا ہوں کہ تم کو بھی آئے گی کہ یہ کیا بکتا ہے۔ مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا ہے۔ چاہے الہام کچھ چاہے اوہام کچھ۔ جس برس سے یہ قطعہ لکھ رکھا ہے:

من کہ باثم کہ جاوداں باثم
چوں نظیری قنات و طالب مرد
در گنجیدہ در کدای سال
نزد غالب بگو کہ "غالب نرڈ"

اب بارہ سو گنچتر ہیں اور "غالب نرڈ" کے بارہ سو ستر (۱۲۷۷) ہیں۔ اس مصرعے میں جو کچھ مسرت پہنچی ہو پہنچنے لے دو دن بھر ہم کہیں۔^{۲۶۵}

چخی عبد البہیل جنون بریلوی نے اس مصرع کے بارے میں دریافت کیا تھا۔

کیستم من کہ تا ابہ ۲۷

اس کے جواب میں غالبؒ نے پنج شنبہ ۱۸ ستمبر ۱۸۵۹ء کو لکھا کہ:
لا حول ولا قوۃ! یہ مصرع میرا نہیں۔ "تا ابہ ۲۷" یہ قاری لالہ قلی

کی ہے۔ میرا قطعہ یہ ہے:

کیستم من کہ جاوداں ہاشم
چوں نظیری نہاد و طالب نرد
در گنجیدہ در کداحں سال
نرد غالب؟ گو کہ "غالب نرد"

یہ مازہ تاریخِ وقایع از روئے نجوم نہیں، بلکہ از روئے کشف ہے۔
اناللہ وانا الیہ راجعون۔^{۳۷۵}

مرزا کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ ۱۲۷۷ھ میں مرجا نہیں گئے۔ چار شنبہ
۶ جن ۱۸۶۰ء کو میر مہدی بھڑوچ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

اب کے ایسا بچار ہو گیا تھا کہ مجھ کو خود افسوس تھا۔ پانچویں دن غذا
کھائی۔ اب اچھا ہوں، سندرست ہوں۔ ذی الحجہ تک ۱۲۷۶ھ تک کچھ
کھٹا نہیں ہے۔ محرم کی پہلی تاریخ سے اللہ مالک ہے۔^{۳۷۶}

یوسف مرزا کے نام دو شنبہ دوم جمادی الاول ۱۲۷۶ھ مطابق ۲۸ نومبر
۱۸۵۹ء کو ۱۲۷۷ھ میں مرنے کے بارے میں لکھتے ہیں:

میں تو نہیں کے باب میں حکم اخیر سن لوں۔ پھر رام پور چلا
جاؤں گا۔ جمادی الاول سے ذی الحجہ تک ۸ مہینے اور پھر محرم سے
۱۲۷۷ھ سال شروع ہوگا۔ اس سال کے دو چارہ حد دس گیاہہ
مہینے غرض کہ انیس مہینے ہر طرح بسر کرنے ہیں۔ اس میں رنج
و راحت و لذت و محنت جو مقوم میں ہے وہ پہنچ جائے اور پھر مٹی
مٹی کہتا ہوا ملک عدم کو چلا جاؤں گا۔ جسم رام پور میں اور روح
حالم نور میں۔ یا مٹی یا مٹی یا مٹی۔^{۳۷۷}

جہول حالی جب مرزا نے مٹی جہاں تک جوہر^{۳۷۸} سے اپنے مازہ تاریخِ وقایع
"غالب نرد" کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ حضرت ابن شام اللہ سے مازہ بھی غلط ثابت

ہوگا۔ مرزا نے کہا ”دیکھو صاحب! تم ایسی قال منہ سے نہ نکالو۔ اگر یہ ماذہ مطابق نہ نکلا تو میں سر پھوڑ کر مر جاؤں گا۔“^{۳۱۵}

آخر کار بڑی آرزوؤں اور تمناؤں کے بعد ۱۳۷۷ھ کا سال اپنی گونا گوں دل فریبوں اور جاہ کاریوں کے ساتھ آئی گیا۔ اس سال دہلی میں بیٹے کی دہا بھوٹی اور خنت قبر پڑا۔ جس کے نتیجے میں بے شمار جانیں تلف ہو گئیں، لیکن اتفاق سے غالب نہیں مرے۔ انھیں اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ ماذہ تاریخ غلط نکلا، اب لوگ کیا کہیں گے۔ چوں کہ طبیعت میں شوخی تھی اس لیے دوستوں سے کہا کہ میں اتنا ارزاں نہیں تھا کہ دہا میں مر جاتا۔ میرا اس سال مرنا میری شان کے خلاف تھا۔ میر مہدی بحر و ج کو جمعہ ۷ مارچ ۱۳۷۸ ہجری، مطابق ۲۶ جولائی ۱۸۶۱ء کو لکھتے ہیں:

دہا کو کیا پوچھتے ہو؟ قدر انداز تھا کے ترکش میں بھی ایک حیر باقی تھا۔ نقل ایسا عام، لوٹ ایسی خنت، کال ایسا بڑا۔ دہا کیوں نہ ہو، لسان الغیب^{۳۱۶} نے دس برس پہلے فرمایا ہے:

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

میاں ۱۳۷۷ء کی بات غلط نہ تھی مگر میں نے دہاے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسر شان تھی۔^{۳۱۷}

ایسا ہی ایک اور غلط حکم محرم ۱۳۸۰ھ مطابق ۱۹ جون ۱۸۶۳ء کو قاضی مہاراجہ بھیل جوتی بریلوی کے نام لکھا تھا:

میں زندہ ہوں، لیکن نیم مردہ۔ آنھ چہر پڑا رہتا ہوں۔ اصل صاحب فراش میں ہوں۔ میں دن سے پاؤں پر درم ہو گیا ہے۔ کتب پاؤں پہنچ پا سے نوبت گزر کر پنڈلی تک آس ہے۔ جوڑے میں پاؤں ساتا نہیں۔ بول و براز کے واسطے المٹا دشوار۔ یہ سب باتیں ایک طرف، دو بھٹکل روح ہے۔ ۱۳۷۷ھ میں میرا نہ مرنا

صرف میری تھذیب کے واسطے تھا۔ مگر اس تین برس میں ہر روز مرگ نو کا مزہ چکھتا رہا ہوں۔ حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں، پھر میں کیوں جیتا ہوں۔ روح میری اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں۔ کوئی طفل، کوئی اختلاط، کوئی جلد، کوئی مجمع پسند نہیں۔ کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، روح سے نفرت۔ یہ جو کچھ لکھا ہے بے مبالغہ اور بیان واقع ہے۔^{۳۳۵}

آخر وہ مضمون دن بھی آگیا جس کے لیے مرزا برسوں سے مشتاق تھے اور جس دن عربی، ظہوری، طالب، قیام اور نظیری کے شاکر و معنوی اور سب سے بڑے ہندوستانی، قاری اور اردو کے ممتاز ترین نزل گو شاعر کا چراغ زندگی موت کے جھوٹے سے دوشنبہ ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ (۱۵ فروری ۱۸۶۹ء) کو بیٹھ کے لیے خاموش ہو گیا۔^{۳۳۵}

بقول حاتی، مرنے سے چند روز پہلے بے ہوشی ہو گئی تھی۔ پھر پھر، دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لیے افادہ ہو جاتا تھا، پھر بے ہوش ہو جاتے تھے۔ جس روز انتقال ہوا، اس سے شاید ایک دن پہلے میں ان کی عیادت کو گیا تھا۔ اس وقت کئی پہر کے بعد افادہ ہوا تھا اور نواب علاء الدین احمد خاں مرحوم کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ انھوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا، اس کے جواب میں ایک فقرہ اور ایک قاری شعر، جو غالب شیخ سعدی کا تھا، لکھوایا، فقرہ یہ تھا کہ:

”میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ ایک آدمہ روز میں مسایوں سے پرچتا۔“

اور شعر کا پہلا مصرع مجھے یاد نہیں، رہا دوسرا مصرع، یہ تھا:

مگر وہ بھر ہارا بمن سر تو سلامت

مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر دردِ زباں رہتا تھا:

دمِ دانیس بر سرِ راہ ہے

عزِ دوا اب اللہ ہی اللہ ہے^{۳۳۵}

سلطان نظام الدین اولیا کی درگاہ کے محصلِ دُفن ہوئے۔ اردو کے سب سے بڑے قادرِ الکلام شاعر اور خدائے سخن میرا نہیں نے ان کی وفات پر ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا تھا:

گزارِ جہاں سے بارغِ بخت میں گئے
مرحوم ہوئے، جوارِ رحمت میں گئے
مذہبِ حق کا مرتبہ اٹلی ہے
غالب، اسد اللہ کی خدمت میں گئے

مرزا کی وفات پر جاتی، سالک اور دوسرے نامور شعرا نے مرچے کہے۔ فقیر نے ایک طویل مرثیہ قاری میں کہا جو ”لودھ اخبار“ لکھو لیں چھپا تھا۔ یہ مرثیہ ”غالب“ اور ”لودھ اخبار“ نامی مضمون میں دیکھا جاسکتا ہے۔ میر مہدی بخروج کے دو بندہ درج کیے جاتے ہیں:

کیوں نہ وہاں ہو دیارِ سخن
مرگیا آج تاجِ دارِ سخن
ہللی خوش ترانہ معنی
گلِ رنگین و شاخِ سارِ سخن
نفلِ بچہ حدیچہ مضمون
تازگی بخش لالہ دارِ سخن
عرسہ نظم کیوں نہ ہو وہاں
ہے عتاقِ سخن وہ شہسوارِ سخن
کیوں نہ حرفوں کا ہو لباسِ سیاہ
ہے علمِ مرگب شہزادِ سخن
ساتھ ان کے گلی سخن سنجی
ان کا مرقہ ہی ہے حزارِ سخن

آجاری تھی جس سے، وہ نہ رہا
اب نواں ہو گئی بہارِ سخن
نظرِ بھائیوں کہاں وہی
اب یہ ہے حالِ ہائے زارِ سخن

دعوتِ عربی و غیر طالبِ مُرد
اسد اللہ خاں غالبِ مُرد

تھے نکلی سے لقم میں ہسر
فوقِ قضا میں غمِ غمیری پر
اس کا جانی کوئی نہ اس کا نظیر
ایک سے ایک ہے فرضِ بہتر
کون تسکینِ قزاعے خاطر ہو
نکتِ بے یمن ہے دلِ مضر
بار کرتے ہیں صبر کی عقیں
ظلم ہے جاہلِ ناخکیبا پر
آپ کے پاؤں تو نہ چلتے تھے
ٹپے پہ راہِ وصال کی کیوں کر
آتشِ غم کی ہے بھڑک اسی
کام آئے نہ اپنے دیۂ تر
اب تو دیدار کو دکھا دیجیے
میرے نالوں سے ہے چاٹھٹر
کون سنتا ہے اب کسی کی بات
آج کل تو یہ خود ہے گھر گھر

دعوتِ عربی و غیر طالبِ مُرد
اسد اللہ خاں غالبِ مُرد

اب ذیل میں وہ چند تاریخی درج کی جاتی ہیں جو لوگوں سے پوشیدہ ہیں:
 ”تاریخ وفات استادزماں مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی“

حیف رفت آنکہ از کلاش بود
 آفتابا معالی سعدی
 در مہاوینا نظم و نثرش داد
 طالعش اسحاقی سعدی
 ہر کہ دیوان او مطالعہ کرد
 یافت شیریں بیانی سعدی
 بود در ہند بعد مرگ حزین
 چش او ہمزبانی سعدی
 ہر خیسان و ملک در سلکش
 داشت گوہر فطرت سعدی
 سعدی اور ذندہ بودے او بہ سخن
 ساختے میرزائی سعدی
 صہب نے افادش دادی
 یاد از کتب دلی سعدی
 مستح را ز خواندن شعرش
 لذت شعر خوانی سعدی
 از جہاں فکریش نکات داشت
 ہیئت با جہلی سعدی
 وہ اکالیم نظم و نثرش
 سکے سکرلی سعدی
 بود ذات بلاغت آیاتش

مرزا غالب کے آخری ایام

در زمانہ نقشبندی سجدی
گفت آل عمرش تاریخ
رہک جاتی و چلی سجدی = ۱۲۸۵ ہجری
(کتاب "ذیچان تاریخ": ص ۱۷، سید آل محمد بکمرای مارہروی)

منیر شکوہ آبادی ("تخلیلات منیر": ص ۵۱، مطبوعہ ۱۲۹۰ ہجری)
آں غالب دہلوی حکیم و دریاں
سلطانِ خن نظام آلِ یاسین
در نظم و زبانِ قاری نای ویر
در نثر پہ مسجدِ افادات نکیں
برداشتِ رشت ازین سراے کافی
یارب برسانش بفرودہا بریں
دنیا ست سے بدیدہ اہلِ خن
در برجِ لہ چو رشتِ آں سرِ ہمیں
تاریخِ وقایع او چشیں گفت منیر
آءِ الفح عصر و حیفِ غانی حزن
ہجری

مرزا حاتم علی مہر ("خیالات مہر": مطبوعہ ۱۲۸۷ ہجری، ص ۳۹۰)
شاعرِ دہ حضورِ مختار
لئے الحمدِ گرامی آء
گفت ہاتفِ چہو تاریخِ اے مہر
بجائِ غالب نای آء = ۱۲۸۵ ہجری

مولوی عبدالغفور نساج ("کنجِ قوارخ": مطبوعہ ۱۸۷۵ء، ص ۳۹)

کیوں کر نہ ہو الم دل پہ درد کو برے
غالب کے غم میں کرتی ہے سب خلق ہائے
نستاج سال فوت کی مجھ کو ہوئی جو فکر

یولی فرد، دو شعبہ ذیقعدہ وائے وائے = ۱۲۸۵ھ

ذیل میں میر مہدی بھرتیج کا وہ مضمون درج کیا جاتا ہے جو غالب کے
انتقال کے فوراً بعد ۱۷ فروری ۱۸۶۹ء کو ”اکمل الاخبار“ دہلی میں شائع ہوا تھا۔^{۳۷۵}

”ظہر مرقی و رھب طالب مُرد“^{۳۷۶}

اسد اللہ خان غالب مُرد

فخاں اس زمانہ خدار سے، آہ روزگار ناخوار سے، ہر روز نیا نیرنگ
دکھاتا ہے۔ ہر دم دام غم و الم میں پہناتا ہے۔ اس عجبِ آفت کی
موج بلاخیز ہے۔ اس وادی ہول ناک کی ہوا فتنہ انگیز ہے۔ اس
کا آبِ سراپ، اس کی بنیادِ خراب، اس کی راحت جزوِ جراحت،
اس کی راحت سراپہ دو صد آفت، اس کی شکر ذہر آلود، اس کی
اسپہ آرزو فرسود۔ ہر روز فخلِ حیات کو صرصر ممت سے گراتا ہے۔
ہر دم محفلِ سرود سے صدائے ماتم اٹھاتا ہے، کبھی پدر کو فراقِ پیر
سے خوں رلاتا ہے۔ کبھی بھائی سے بھائی کو چھڑاتا ہے۔

ہر گلِ زمیں میں دامِ فریبِ نہاں ہے۔ ہر نوشِ لذت میں بیش
منتِ نہاں۔ خزاں سے تو امِ فصلِ بہار ہے۔ روزِ روشن کے
ساتھ ہی شبِ تار ہے۔ مالِ خندہ شادی کرے غم ہے اور بچہ بیش،
صد گونہ الم۔ حبابِ ابھی نمودار ہوا۔ ابھی کچھ نہ تھا، پھول ادھر کھلا
ادھر کر پڑا، لالہ لباسِ رنگیں میں بھی داغِ دل پر رکھتا ہے۔ فچہ
خونِ جگر سے پردوش ہوتا ہے۔ بلبل، نوحہ کر مہمن ہے اور مرغ

محرزوں اسیر تھی:

دو دس زمانہ بہار و خزاں ہم آغوش است
زمانہ جام بدست و چناڑہ پر دوش است
وہے ہم گراں خوابانِ غفلت پر کہ اس رشید عمر پر تار ٹھکرت سے
زورِ غسل ہے۔ اس کے بھروسے پر کیا کیا طول اہل ہے:
ازاں سرود آمد ایں کا رخ دلآویز
کہ جا تا گرم کردہ گوشت خیر
اس ناہود کو بود، تجیم کو حیم، دمن کو چمن، گلشن کو گلشن، خواب کو
بیداری، غفلت کو ہوشیاری جانتے ہیں اور اس قدر بادِ غفلت
سے مست و لاعقل ہیں کہ حق کو باطل سے نہیں پہچانتے۔ کیا
جب اگر آسمان درپے آزار ہے۔ بھلا اس سے کیا توقع آسودگی
جس کا خود گردش پر مدار ہے۔

دیکھو، بیٹھے بٹھائے کیا آفت اشائی ہے۔ کس منکب روزگار کی
جدا کی دکھائی ہے۔ نکل بروید معانی کو باخترانی سے گرایا۔ سحر
سحر خدائی کو خاک میں ملا یا۔ جو خسرو کے بعد ملکِ خن کا۔
خسرو مالکِ رقاب تھا۔ اس کا نامِ عمر طے ہوا۔ جو میدانِ سنواری
کا شہ سوار ہلالِ رکاب تھا۔ اس کا رنچ زندگی ہے ہوا۔

ان حضرت کی کن کن خوبیوں کا بیان کیا جائے۔ دریا کوزے میں
کیوں کر سائے۔ حسنِ خلق میں اخلاق کی کتاب، عجم الاشعاعی میں
لا جواب، خوبیِ تحریر میں بے نظیر، صافی ضمیر، جاودہ تقریر، قادی
زبان میں لاجئی، ”اردوے معطی“ کے بانی۔ افسوس جس کا شہباز
خیال طائرِ صمدہ شکار ہو، وہ پیرِ کرکب اجل میں گرفتار ہو۔ صمد
حیف اس سادہ آراءِ سنواری کو سمجھنے پر لگائیں۔ ہاں اس رنگیں

خُن کو سفید کفن پہنائیں۔ جو ایک دم فراقِ اہل کی تاب نہ لائے
اس کو یوں تجا قبر میں چھوڑ آئے۔

اس غم میں سب کی حالت جاہ کی ہے۔ روز بھی اس مصیبت میں
سیا ہے۔ اس روز کو روزِ محشر کہیں مگر کیا کہوں۔ سنتے ہیں کہ
قیامت میں چھڑے ہوئے لمبے کے، ملاقاتیں کریں گے۔ یہ کیسی
قیامت آئی ہے، جس میں ایسے شفیق نے ہدائی ہے۔ دل ہے
چتر نہیں، اس صدمہ چائناہ سے کیوں کر نہ گھبرائے۔ چشم ہے فولاد
نہیں، کیوں کر اشک نہ بہائے۔ جس کا سیدہ شتر دار ہو اس کے
لب پر کیوں کر نہ آہ شربار ہو۔ جس کا بگر خیر غم سے نگار ہو وہ
کیوں کر نہ بے قرار ہو۔ جس کی جان میں کاوش پنہاں ہو، وہ
کیوں کر نہ تالاں ہو، جس کے دل میں غم جاں غسلِ دشنہ شکن ہو
اس کا کیوں کر نہ خوچکاں خن ہو، قلم بھی میری طرح سید چاک
ہے اور دیدہ دولت گر یہ تاک۔ اب قریح اجمال و تفصیل
مقال ہے۔

واضح ہو کہ جناب مرحوم دو تین مہینے صاحبِ فراش رہے۔ ضعف و
نقاہت کے صدمے سے۔ آٹھ دن انتقال سے پہلے کھانا چٹا ترک
فرمایا۔ اس دنیاے فانی سے بالکل دل اٹھایا تا آن کہ ۱۵ فروری
۱۸۶۹ء مطابق ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ روزِ دوشنبہ کو دوپہر ڈھلے سحر
فلک کے ساتھ ہی اس خورشیدِ اوجِ فضل و کمال کو زوال ہوا، یعنی
اس سچھی سراسے بے بنیاد سے عدمِ آباد کی طرف کوچ کیا۔ نہ غمِ
زور کی تکلیف پائی، نہ کشاکشِ جان کنی کی مصیبت اٹھائی۔

سب علماء شہرِ ہیرانِ دہلی دروازہ نمازِ جنازہ میں شریک ہوئے۔
بعد نماز کے حضرت سلطان نظام الدین قدس اللہ سرہ کی درگاہ

میں پہنچایا اور اس کچھ معافی کو جو خاک چھپایا۔ اس بھروج دل
انکار نے یہ حال سراپا ملال اس لیے درج اخبار کیا تاکہ اس قدوہ
شعر کے بھائی پامنا حضرت مغفور کے مستحق رحمت ہونے کی خبر
پائیں اور چشم بزم سے ایک حسرت بہائیں۔

قطعہ تاریخ

کل مرقہ استاد پہ افراط الم میں
ہاتف نے جو پیٹھے ہوئے دیکھا مجھے غم ناک
بولا، ہے اگر لکھ میں تاریخ کی، بھروج
کہ دے نہ بھی ”کچھ معافی ہے تیر خاک“^{۳۸۵}

حوالے اور حواشی

- ۱۶۵۔ ”اردو سے پہلے“: مطبع کھڑائی، دہلی، ۱۸۹۹ء، صفحہ ۳۶، ”مخطوط قاضی“ جلد اول،
مرتبہ: مولوی محمد پرشاد۔
- ۱۶۶۔ ”دہلی کا آخری سانس“: مسعود، غولبر حسن نگاری۔
- ۱۶۷۔ ”سچ آج بھی“: صفحہ ۳۸، مطبع دوم۔
- ۱۶۸۔ ”اردو سے پہلے“: ص ۲۱۔
- ۱۶۹۔ ایضاً ص ۷۷۔
- ۱۷۰۔ ”مخطوط قاضی“: ص ۷۵۔
- ۱۷۱۔ ”اردو سے پہلے“: ص ۹۔
- ۱۷۲۔ ایضاً ص ۲۱۔
- ۱۷۳۔ ”مخطوط قاضی“: ص ۱۲۱۔
- ۱۷۴۔ ”اردو سے پہلے“: ص ۳۹۔
- ۱۷۵۔ قدر نگاری۔ قاضی سے ان کی بڑی ماہ و رسم تھی۔ ان کا انتقال ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۴ء) میں ہوا۔

- مرزا علی قلی نے چار سال وفات کی۔ ("دیوانِ غالب": ص ۱۵۹، مطبعِ جہان، لکھنؤ، ۱۸۸۵ء)۔
- میر انکسالی حضرتِ قادر
سن کے رنج و الم ہوا عالی
کبھی ہرج و مرج سالِ رحلت کی
"قدر نے آہ کی تھا" غالب
- ☆۱۴۔ "مخطوطِ غالب": ص ۹۵۔
- ☆۱۳۔ ایضاً، ص ۹۵۔
- ☆۱۵۔ ایضاً، ص ۱۵۳۔
- ☆۱۶۔ "امروے مطبوعہ": ص ۸۔
- ☆۱۷۔ "مکالمہ غالب": ص ۵۶، مرتبہ: امتیاز علی خاں مرثیہ۔
- ☆۱۸۔ "امروے مطبوعہ": ص ۲۳۔
- ☆۱۹۔ ایضاً، ص ۱۸۵۔
- ☆۲۰۔ "مخطوطِ غالب": ص ۱۲۱۔
- ☆۲۱۔ "امروے مطبوعہ": ص ۲۲۲۔
- ☆۲۲۔ ایضاً، ص ۲۵۔
- ☆۲۳۔ ایضاً، ص ۲۲۔
- ☆۲۴۔ ایضاً، ص ۳۔
- ☆۲۵۔ بے تحریر کے بارے میں ملاحظہ ہو "غالب اور شاہانِ اودھ"۔
- ☆۲۶۔ "امروے مطبوعہ": ص ۲۰۔
- ☆۲۷۔ "امروے مطبوعہ": ص ۲۱۲۔
- ☆۲۸۔ "مخطوطِ غالب": ص ۲۶۴۔
- ☆۲۹۔ "امروے مطبوعہ": ص ۲۶۱۔
- ☆۳۰۔ ہمارے نگار کے لیے دیکھو "غالب اور شاہانِ اودھ"۔
- ☆۳۱۔ "نگارِ غالب": ص ۸۸۔
- ☆۳۲۔ غالب اپنے کوسمیں انیسب" کہتے تھے۔
- ☆۳۳۔ "امروے مطبوعہ": ص ۱۳۰۔
- ☆۳۴۔ "مخطوطِ غالب": ص ۱۲۱۔
- ☆۳۵۔ "گنجِ قزوینی": ص ۳۹، مطبوعہِ قزوین، لکھنؤ، ۱۸۷۵ء۔
- ☆۳۶۔ "نگارِ غالب": ص ۸۹۔
- ☆۳۷۔ "تختِ لعل": لاہور۔ غالب قبرستانِ لاہور کی قبر کی ۱۹۲۹ء، ص ۶۷۲، ضمیمہ کارِ سنجہ مبینِ اربعین۔
- ☆۳۸۔ ہجرت کے دیوان (مطبوعہِ قزوین) ص ۲۳۹، مطبوعہ ۱۸۹۹ء میں یہ قصیدہ انکسالی کے ساتھ ہیں

درج ہے:

کل صورت و احوال میں نہیں با دلی گروں
خدا تہجد اوجہ پہ بیجا ہوا غم ناک

مرزا غالب کے آخری ایام

دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی بھورت
 غالب نے کہا: "گیا سہالی ہے جو خاکہ"

غالب کے کوہِ حرار پر بھی بھورت کا یہی قصہ لکھ رہا ہے۔ لیکن پہلے مصرع کو اس طرح بدل دیا گیا ہے۔
 گل میں غم و اندوہ میں ہاتھ بھورتوں



☆ مصرع اصل میں یوں ہے:
 رنگِ حرق و غر غالب فرد (1914)



غالب کا مزار بے توجہی کا شکار

غالب نے اپنے ہم وطنوں کی سرد مہری اور بے مروتی کے بارے میں پیش کوئی کی تھی:

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہری یارِ اہل وطن یاد نہیں

ہم ہندوستانوں میں ایک بڑا صیب یہ ہے کہ اپنے اسلاف کے سرمائے کی قدر نہیں کرتے۔ برعکس اس کے کہ اہل مغرب اپنے بزرگوں کی معمولی سے معمولی شے کو بھی حیرت کچھ کر یا نگار کے طور پر محفوظ رکھتے ہیں۔ شہنشاہ الیڈورڈ ہفتم کی بڑی ہمیشہ شہنشاہ برٹنی کی والدہ تھیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کی بناٹی ہوئی تصویروں کی قیمت ایک ایک کروڑ روپیہ قرار پائی۔ اسی طرح انگلستان کے جاویدیاں شاعر کاؤپر کے خطوط بیکاس یا ساٹھ لاکھ میں بیلام ہوئے۔ ولایت میں ایک مڑی نکت شروع زمانے کا کسی غریب کو مل گیا۔ اخباروں اور رسالوں میں عرصے تک اسی کے حلق مضامین شائع ہوتے رہے۔ ایک رئیس نے اس کو اتنی بڑی رقم دے کر مول لیا کہ تین شینے کو محتاج مزدور پٹھاپشت کے لیے امیر بن گیا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے ایسی بے نظیر اور

عالم کا حرار ہے تو حق کا حرار

نادر و کم یاب چیزیں دیکھی ہیں جن کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یہ نادر یا تو رنگ خوردہ صندوقوں میں لاوارث قیدیوں کی طرح کسی جرم بے گناہی کی پاداش میں دم توڑ رہے ہیں یا غفلت سے ضائع کر دیے جاتے ہیں۔ افسوس اس بات پر ہو رہا ہے کہ ہماری عدم توختی کی وجہ سے ہماری پیش بہا نظائیاں اور قیمتی سرمایہ انگلستان پہنچ کر لندن میوزیم کی تدر ہو گیا ہے۔ ہماری بے ذوقی پر اقبال کو بھی خون کے آنسو بہانے پڑے:

منوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
شریاء سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آپا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سپارا

ہم نے ان لوگوں کو بھی نہیں بخشا جو ہندوستانی شعر و ادب کے تاج میں کوہ نور کی طرح جگمگاتے تھے۔ ہم نے ان کی آخری آرام گاہوں کو بچنے ہوئے دیکھا ہے اور اسے سخت دل اور خود غرض ہیں کہ پھر بھی کوئی عبرت حاصل نہیں کرتے۔

اردو ادب کے سر تاج شاعر مرزا غالب، خاکسبانی ہند استاد ذوق اور عاشق مزاج حکیم مومن خاں مومن کو کون نہیں جانتا۔ تینوں نے زمین شعر کو آسمان بنا دیا۔ ان کے دیران شدہ حرار ہمارے لیے مہرت کا تازیانہ ہیں۔ مومن کی قبر کا کہیں نام و نشان نہیں مل رہا۔ ذوق کے بارے میں ان کے شاگرد رشید مولانا محمد حسین آزاد کے یہ خوب صورت الفاظ اب تک "آب حیات" میں موجود ہیں:

جب وہ صاحب کمال، عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا،
تو فصاحت کے فرشتوں نے ہارغ قدس کے پہلوں کا تاج پہنایا،
جس کی خوشبو شہرت عام بن کر جہاں میں پھیلی اور رنگ نے
بھائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پر رکھا گیا تو
آب حیات اس پر شمیم ہو کر برسا کہ شادابی کو کلاہٹ کا

اثر نہ پہنچے۔

آج سے پورے نوے سال پہلے ذوق کی قبر کی مرمت ایک باذوق اردو نواز نے کرائی تھی۔ مرمت کے بعد حزار پر قوالی کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ اب ہماری بے حسی کے باعث قبر کی حالت ایسی ناگفتہ بہ ہے کہ بیان کرتے شرم آتی ہے۔

موتن اور ذوق کے بعد غالب کا انتقال فروری ۱۸۶۹ء میں ہوا۔ ان کے شاگرد میر بحر و ج نے تاریخ کبھی جو لوح حزار پر اس طرح کندہ تھی:

رہبِ عرقی و لجرِ طالبِ نرد
اسد اللہ خان غالبِ نرد
کل میں غم و اعداء میں با خاطرِ مخروں
تھا تربتِ استاد پہ بیضا ہوا غمِ ناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی بحر و ج
ہاتف نے کہا، ”گنجِ معانی ہے یہ خاک“

(۱۸۸۵ء) (۱۸۶۹ء)

”مخزن“ لاہور، صفحہ ۵۹، بابت مارچ ۱۹۰۷ء، میں ”شعرا کے حزار“ کے عنوان سے لکھا ہے:

مرزا غالب کی عینِ قبر پر پاس والی اجاڑے کی دوبارہ تھوڑے دن ہوئے، گر پڑی اور قبر تمام اس کے نیچے دب گئی۔ لوحِ حزار کو، جس پر بحر و ج کی کبھی ہوئی تاریخ کندہ ہے، تعجب کی بات ہے کہ کوئی صدمہ نہیں پہنچا، ورنہ یہ پتھر سب سفید بہت چلا ہے۔ اگر دوبارہ کا کوئی ہماری پتھر اس پر آکر پڑتا تو یہ ضرور ٹوٹ جاتا۔ اس قبر کو اوپر سے صاف کروا کے دوبارہ اجاڑے کی دوبارہ کو بنوا دینا بہت ضروری ہے ورنہ رفتہ رفتہ حالت ابتر ہوتی جائے گی۔

کچھ عرصے کے بعد، مارچ ۱۹۱۰ء میں، حزار غالب کی لوح ٹوٹ گئی، اس کے

غالب کا حوالہ ہے قومی کا حوالہ

باوجود جوڑ کر دوبارہ نصب کی گئی۔ اس کا فوٹو میں نے کسی رسالے میں دیکھا تھا۔ اس دوران اردو کے مشہور ادیب، شاعر اور صحافی پیارے لال شاکرؒ (متوفی ۱۹۵۶ء)، عشق گوشت رائے نظر کے بعد، جون ۱۹۱۱ء میں ”ادیب“ الہ آباد ہندوستانی لیجنڈ کے ایڈیٹر ہوئے۔ وہ اردو کے عاشق اور غالب کے دل دادہ تھے۔ انھوں ہی نے مزار غالب کی پتا کا ڈول ۱۹۱۵ء میں موصوف نے غالب کلب، غالب ہال اور روضہ غالب کی تعمیر وغیرہ کے لیے ”غالب میموریل فنڈ“ قائم کیا، لیکن کسی نے ان کے ساتھ تعاون نہیں کیا۔ وہ نہایت بے لوث اور مخلص شخص تھے۔ لوگوں سے ایکلوں پر اپیلیں کرتے رہے لیکن بے سود۔ ”ادیب“ الہ آباد میں اپنی تحریر ”غالب“ کے عنوان سے لکھتے ہیں:

غالب نے اردو نظم و نثر پر جو احسانات کیے ہیں ان سے اہل
یورپ کو زودشاس کرانے کی اشد ضرورت تھی۔ ہمیں مسٹر صلاح
الدین خدا بخش ایم اے، بی اے ایل کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں
نے انگریزی میں ایک کتاب غالب کے محقق شائع کر کے ایک
بڑی علمی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب ولایت میں چھپی ہے
اور اس میں غالب کی اردو فارسی شاعری پر مبسوط بحث کے علاوہ
ان کے سوانح کا بھی ذکر نہایت دلچسپی سے کیا ہے۔ (”ادیب“
جولائی اگست ۱۹۱۲ء)

اس سے ایک سال قبل انھوں نے ”غالب“ کے عنوان سے ایک حیرت انگیز
اپیل شائع کی تھی۔ لکھتے ہیں:

اردو لٹریچر کو جس قدر ترقی غالب مرحوم کی بدولت ہوئی ہے وہ
شاید کسی اور بزرگ سے نہیں ہوئی ہوگی۔ اسی غالب کا حزار اب
ایسا کس مہری کی حالت میں ہے کہ اسے دیکھ کر غیر ملک کے
رہنے والوں کو حسرت ہوتی ہے۔ چنانچہ ”پائینر“ (Poincar)
کے ایک نامور ڈاکٹر مارٹن نے ایک مراسلے میں لکھا تھا:

اب کے جو میرا دلی جانا ہوا تو شاء نظام الدین اولیا کے احاطے کے باہر ایک خادم نے مجھے ایک قبر دکھائی۔ پھر اس کے پاس لے جا کر کہنے لگا کہ یہ عالب کی قبر ہے (آہ! وہی عالب جس کا یہ شعر ہے:

عالب نام آدم، نام و نظام میری

ہم اسد اللہم، ہم اسد اللہم

ٹوٹی ہوئی قبر جس کے سرخانے سب مرمر پر کتبہ اور اس کی بھی وہ حالت کہ میاڈا ہالڈ بھی معلوم دیتا تھا کہ دو ایک برساتوں کے بعد یہ بھی قبر کے ساتھ مل کے جو خاک ہو رہے گا اور اس کے ساتھ زبان اردو کا ایک سر بلند علم سرنگوں ہو کر مٹی میں ایسا طے گا کہ اس کا نشان تک نظر نہ آئے گا۔ تو کیا مجھے اس امر کا حق ہے کہ کلام عالب کے دل دادگان پر استغاثہ کروں؟ مؤرخ، مصنف، شاعر، جس قوم میں ہوں وہ اس قوم کے بیش بہا جواہر ہوتے ہیں یہ مال ضائع نہیں کرتے بلکہ جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ ان کی قبریں نہیں بلکہ بیش قیمت خزانوں کے دھننے ہیں۔ ان حرکات کی کچھ قیمت نہیں۔ یہ آن مول رتن ہیں۔ ان مقدس ترہوں کو بردہا ہونے دینا گناہ ہے اور گناہ کے ساتھ تقصیر جو آنے والی نسلیں بھی معاف نہ کریں گی۔ میری خواہش ہے کہ یہ قربت بردہا نہ ہونے پائے۔ میری یہ تمنا ہے کہ یہ مرقہ باقی رہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ یہ ڈمیر قائم رہے۔ اس لیے میں تجویز کرتا ہوں کہ زیادہ نہیں تو ایک ایک بروہے کا عام چندہ ہو اور پھر دو تین ہزار میں ایک مضبوط چھوٹی سی عمارت بنا کر مرنے

والے کا زندہ نشان قائم کیا جائے۔

منہرہؔ ہالا سطور کو ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ایک یورپین ڈاکٹر کے الفاظ ہیں۔ جو نہیں کھائے ہوئے دل پر خیر و شکر کا کام کرتے ہیں۔ وہ غالبؔ کو قوم کا بیش قیمت مال بتاتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ اس قبر کو برباد ہونے دینا ایسا گناہ اور تقصیر ہے کہ آنے والی نسلیں اس کو معاف نہ کریں گی۔ اس کے بجلی معنی ہیں کہ آئندہ نسلیں اس معزز تربت کو ترکے میں پانے والی ہیں۔ اس ترکے میں اصراف کرنے کا موجودہ نسلوں کو کوئی حق نہیں۔ یہ امانت ہے اور امانت بھی ایسی جو ایک نسل سے دوسری نسل کو پہنچنی چاہیے۔ آنے والی نسلیں جب غالبؔ مرحوم کے حرار کی جستجو کریں گی اور اس کا پتا یا نشان پانے کے لیے اس قسم کی تکلیف کا سامنا ہوا جو آج کل کے ماہرین علم آثار الضادہ کو تابہت سکید کے دریافت کرنے میں ہوئی، تو کیا کہیں گی؟ یاد رکھو کہ یہ جرم نہ معافی کے قابل ہوگا نہ عذارت کے لائق۔ آہ! مرنے والے نے اپنی زندگی ہی میں کہہ دیا تھا:

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا

نہ کبھی جنازہ اٹھا، نہ کہیں حرار ہوتا

وہ دن ابھی دور ہے کہ ہمارے ہندوستان میں کوئی غالبؔ کلب یا غالبؔ ہال قائم کیا جائے، مگر کیا ہم اس درجہ پست جنت اور ایسی نمایاں وطنی عظمت میں مبتلا رہیں گے کہ غالبؔ ایسے زندہ جاوید شاعر کی مٹی مٹائی قبر کو بربادی سے نہ پہچانیں اور اس کے رے سے نشان کو ابد الابد تک قائم رکھنے میں دریغ کریں۔ افسوس:

کرتے کس صحرے سے ہو تربت کی شکایت غالبؔ

تم کو بے مہری پاراں وطن یاد نہیں

”ادیب“ کے اجرا کا سب سے بڑا مقصد ملک میں لٹریچر مذاق پیدا کرنا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہماری کوشش سے عالم کی قبر برداری سے بچ جائے تو یہ ہماری سب سے اعلیٰ خدمت ہوگی۔ لہذا ہم اس مہینے سے عالم میسوریل فنڈ (چند یادگار عالم) کھولتے ہیں اور شیدائیان کلام عالم سے استفادہ کرتے ہیں کہ وہ خود بھی اس مفید تحریک میں حصہ لیں اور اپنے احباب کو بھی اس طرف رجوع کریں۔ جو کچھ بھی ارسال ہوگا، شکریہ کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔ یہ تادیب بھی ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ”عالم میسوریل فنڈ“ میں جو روپیہ فراہم ہوگا، اس کا بے جا استعمال نہ کیا جائے گا۔ ”کاسٹل“ کے قاتل ایڈیٹر مسٹر محمد علی (جوہر) بی اے تحفہ اطرہات حیدر کر رہے ہیں اور انہوں نے اپنے اخبار میں فنڈ کھولا ہے۔ کافی روپیہ فراہم ہونے پر ایک مستقل یادگاری روضہ تعمیر کیا جائے گا۔ ممکن ہے کہ روپیہ کی فراہمی تک جناب مولوی حسن نظامی صاحب بلاد اسلامیہ کی سیاحت سے واپس آجائیں اور روضہ عالم کی تعمیر انہی کی نگرانی میں ہو۔

(ایڈیٹر ”ادیب“، اگست ۱۹۱۱ء)

پیارے لال شاکر نے جنوری ۱۹۱۳ء میں ”ادیب“ اور آباد کی ایڈیٹری سے قطع تعلق کیا اور لکھنؤ سے مارچ ۱۹۱۳ء میں اپنا رسالہ ”انصر“ کے نام سے جاری کیا۔ اس کی جلد ۳، نمبر ۳، اپریل ۱۹۱۳ء میں انہوں نے اردو والوں کو پھر احساس دلایا کہ وہ حرار عالم کے لیے اقدام کریں۔ ”حرار عالم“ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

”انصر“ کے اس نمبر میں جناب خلیق دہلوی کی ایک نظم درج کی جاتی ہے جس میں حرار عالم کی حلاجی زار بیان کر کے پبلک

سے اہل کی گئی ہے کہ وہ اس کو کم نای کے ہاتھوں سے بچائیں۔ دہلی کے چند خاص حضرات اس کے حلقہ کوشش فرما رہے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ معاونین ”العصر“ بھی اس کا رخنہ میں حصہ لیں۔ چار برس ہوئے مسز محمد علی نے ”بھرد“ میں ایک اہل شائع کی تھی اور پبلک نے اس تجویز کو نہایت پسند کیا تھا۔ چنانچہ ایک معقول رقم جمع بھی ہوئی تھی۔ جس کی رسید ”بھرد“ میں چھپی تھی۔ خود ہم نے بھی ”ادیب“ مرحوم میں غالب محمود علی فخر کھولا تھا اور ایک خاص رقم اس سلسلے میں وصول ہوئی تھی۔ جب ہم نے ”ادیب“ سے قطع تعلق کیا تو وہ رقم بھی اٹرین پریس کے حوالے کر دی۔ اس کے بعد ہم نے دو تین دفعہ مسز محمد علی کو تحریر کیا کہ اگر کام شروع کرنے کا ارادہ ہو تو یہ روپیہ منگایا جائے مگر ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ چوں کہ حکیم محمد اہل خاں اور خواجہ حسن نظامی ایسے افراد اس تحریک میں شریک ہیں لہذا پبلک کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ ان کا علیحدہ مانگاں نہ جائے گا۔ ”ادیب“ کے ذریعہ سے جو رقم فراہم ہوئی تھی وہ اس کام کے لیے اٹرین پریس سے ہر وقت مل سکتی ہے۔ نہیں معلوم مسز محمد علی کے جمع کردہ چھوٹے کا کیا حشر ہوا۔ جو حضرات اس کا رخنہ میں حصہ لینا چاہیں وہ اپنے عطیات حکیم محمد اہل خاں صاحب کے نام پر دہلی کے پتے پر ارسال فرمائیں۔

”العصر“ کے اس شمارے میں خلیق دہلوی کی نظم بہمنان ”حرار عالم“ درج

ہے اس میں ۱۳ بند ہیں چوں کہ نظم فکر انگیز ہے اس لیے چند بند درج کیے جاتے ہیں:

ہیں مہربان میرے خواجہ حسن نظامی
جن کی ہے ذات اقدس وصالیت کی حامی

منہموں نگاروں سے ہیں دور دور نامی
جہڑتے ہیں پھول منہ سے صدقے میں خوش بیانی

☆

درگاہ میں ہے روتی فیض قدم سے ان کے
اوصاف کیا بیاں ہوں میرے قلم سے ان کے

☆

ملنے کا شوق ان سے دل میں ہوا زیادہ
درگاہ اولیا کا میں نے کیا ارادہ
صحت کا لطف آیا، پایا حراج سادہ
تحریف کر رہا تھا ہر ایک مجراوہ

☆

درگاہ دیکھنے کو بے تاب ہو رہے تھے
سیماب بھی وہیں پر سیماب ہو رہے تھے

☆

جب میر کرنے لگے، دیکھا حزار عالم
رہ زمیں نہاں تھی فصل بہار عالم
یاد آرہا تھا سب کو وہ افکار عالم
ظہروں میں پھر رہا تھا حور و وقار عالم

☆

حسرت برس رہی تھی روتی تھی خوش بیانی
اردو لہ کے اوپر کرتی تھی نوحہ خوانی

☆

سب حزار بالکل ٹوٹا ہوا پڑا
پھایا تھا آسمانی تربت چ شامیانہ

عالم کی صحبتوں کا یاد آگیا زمانا
وہ نظم عارفانہ، مضمون عاشقانہ

☆

ہر بات میں عرافت، ہر شعر میں لطافت
پانچ وضع داری، دل دادہ شرافت

☆

عالم کی یاد دل میں پھر پھر کے آ رہی تھی
دنیا کی بے چاکی آنکھوں میں چھا رہی تھی
حسرت نکل نکل کے آنسو بہا رہی تھی
دور زمیں کی گردش نقشہ مٹا رہی تھی

☆

مٹی کا، میرزا کو کمر یاد کر رہا تھا
قریب کا ذرہ ذرہ فریاد کر رہا تھا

☆

افسوس زندگی ہے بے اعتبار کیسی
ہر چیز دھنسی ہے ناپائیدار کیسی
جاتی ہے بوستان سے فصل بہار کیسی
شکلیں نہاں ہوئی ہیں زیرِ مزار کیسی

☆

بزمِ سخن کی زینت، روح و روانِ دلی
مٹ جائے اس طرح سے نام و نشانِ دلی

☆

افسوس، قبر اس کی ٹوٹی ہوئی پڑی ہے
بوسیدہ ہو گئی ہے، پھوٹی ہوئی پڑی ہے

دسب فلک سے ہانکل لوٹی ہوئی پڑی ہے
بے غور ہے، نظر سے چھوٹی ہوئی پڑی ہے
شٹنے کو ہو رہی ہے، غالب کی یاد ساری
شعر و سخن لحد پر کرتے ہیں آہ و زاری

☆

غالب کے قدر دانوں اس قبر کو بنا دو
نوحا ہوا پڑا ہے سبک لحد، بجا دو
یہ یاد رفتگاں ہے، جو حق نے ہے دیا، دو
جیسا جو ایک دے گا، دے گا اُسے خدا دو

☆

ہیں ہم زبان میرے خواجہ حسن نظامی
دل سے ہوئے ہیں جالب ^{۳۵} اس کے خلیق حامی

نظامی بدایونی (۳-۱۹۳۷ء) نے دیوان غالب کا ایک خوب صورت ایڈیشن
مع تصویر غالب ۱۹۱۵ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع کیا۔ جب انھیں حرار غالب
کی شکستہ حالت کا احساس ہوا تو انھوں نے چندے کی انجیل کی جو ”الناظر“ لکھنو پابست
ستمبر ۱۹۱۶ء (ص ۵۶) میں شائع ہوئی تھی۔ یہ انجیل ”مرزا غالب کے حرار کی مرستہ“
کے عنوان کے تحت ان الفاظ میں کی گئی تھی:

میں اپنی طرف سے اردو دیوان غالب کے خاص ایڈیشن کی جیڑ
۳۰۰ جلدیں اسی ضروری کام کے لیے اس طرح سے پیش کرتا
ہوں کہ وہ تمام ادیبانِ اردو و احساس جو مرزا غالب جیسے اردو
ادب کے حسن کی یاد کو زندہ رکھنا ضروری سمجھتے ہیں، اجازت دیں
کہ میں اردو دیوان غالب کا خاص ایڈیشن جو بجائے خود مرزا سے
مرحوم کی یادگار ہے اور جو نہایت اہتمام اور خوش سلیقگی سے عالی

غالب کا حرار ہے توغنی کا حرار

جناب سید راس مسعود صاحب کی تحریک سے شائع کیا گیا ہے، سب کتابیں فروخت ہو جائیں تو کل روپیہ بعد وضع کمیشن و مصارف ڈاک وغیرہ خلیق دہلوی یا کسی دوست کے جو دہلی میں مقیم ہوں سپرد کر دیا جائے تاکہ اس تاج دارغنی کے ٹوٹے ہوئے حرار کی، جس کا نظارہ اہل نظر اور اہل دل کے لیے ایک عبرت ناک سین کا کام دیتا ہے، مرمت کر کے آجاء سلف کی بقا و حفاظت کے فرض کفایہ کو انجام دیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ حرار غالب کی مرمت و توسیع کے لیے بہت لوگوں نے سروکار کوششیں کی تھیں۔ ان میں پیارے لال شاہر میرٹھی، نوبت رائے لکھنوی، خلیق دہلوی، غلامی بدایونی اور خواجہ حسن نظامی ہمیشہ پیش پیش رہے تھے۔ جب ان کی اپیلوں سے کوئی اثر نہیں ہوا اور جو چند جمع ہوا تھا اس کا بھی کوئی پتا نہیں چلا پھر عرصہ دراز تک خواجہ صاحب نے اپنی مخلصانہ کوششیں جاری رکھی تھیں۔ انھوں نے حرار غالب کی تجدید تعمیر کے لیے تاحسبی کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ ان کی خاتم آخری اپیل ”مرقد غالب“ کے عنوان کے تحت اردو کے نامور رسالے ”ہمایوں“ لاہور، بابت اپریل ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اردو کے مایہ ناز محقق جناب قاضی عبدالودود صاحب نے خواجہ صاحب کی اپیل کو اپنے ماہ نامے ”معیار“ پندرہ بابت مئی ۱۹۳۶ء میں خواجہ صاحب کے الفاظ میں یوں شائع کیا تھا:

غالب کا حرار میری دگاہ کے قریب لب سڑک (کڈا) واقع ہے۔ حرار کے پائیں یعنی جنوب میں اکبر کے کوا مرزا عزیز..... کا مقبرہ ہے۔ حرار کے غرب میں قبر سے ملی ہوئی نیلم صاحبہ حکیم واصل خاں مرحوم کی دیوار ہے۔ پھر تین سو گز کا ایک قطعہ زمین ہے جس کے وارث اب موجود نہیں۔ ”غالب سوسائٹی“ کا ارادہ ہے کہ شمالی دیوار کو ہٹا کر شکستہ قبرستان درست کر دیا جائے۔ اور

شمال کی طرف، سڑک کے پاس ایک شان دار دروازہ بنا دیا جائے اور جتنی زمین مرحومہ بیگم صاحبہ نے حزار کے غرب میں عطا فرمائی تھی اس کو شامل کر کے غالب کا حزار اتنا اونچا بنا دیا جائے تاکہ آئندہ چلے اور مشاعرے حزار کے قریب ہی ہو سکیں۔ غالب کا حزار ثواب صاحب لوہارو کے قبرستان میں ہے۔ اس لیے قبرستان کے وارث غالب کا حزار بنانے میں مزاحمت کرتے ہیں۔ لہذا تجویز کی گئی ہے کہ صرف غالب کی قبر کو بنا دیا جائے۔ لوہارو والوں کو اپنے بزرگوں کا خیال ہوگا تو خود بنوا لیں گے۔

حزار غالب اب اس اصطبل کی صورت اختیار کر گیا ہے جہاں آوارہ لاوارث جانور کس مہری کی حالت میں اپنے مالکوں کی لاپرواہی پر گریہ کناں ہوتے ہیں۔ یہاں تلاشت کے ڈیمبر رہتے ہیں۔ غالب کی قبر ۱۹۵۵ء میں بنائی گئی تھی۔ اگر غالب کے پرستار غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر ۱۹۶۹ء میں وزیر اعظم شریعتی امداد گاندھی سے رجوع کرتے تو سرکاری امداد سے قبر غالب پر ایک شاندار روضہ بنایا جاسکتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک کتب خانہ، میوزیم اور ریسرچ کرنے والوں کے لیے ایک ہال بھی تیار ہوتا جہاں ادبی چلے اور مشاعرے منعقد کیے جاتے۔ جب میں نے، ایک عرصہ ہوا، بہت غالب کی زیارت کی تو حیران و ششدر رہا کہ اتنا بڑا شاعر اور ادبی چھوٹی قبر۔

۲۳ اگست ۱۹۹۶ء کو پی بی سی لندن نے بھٹی اور اردو نثریے میں اس چوٹا دینے والی خبر سے دنیا کو مطلع کیا کہ بھارت کی سپریم کورٹ نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ مرزا غالب اور شیخ ابراہیم ذوقی کی قبریں خستہ حالت میں ہیں اور دہلی کی انتظامیہ کی سرزنش کی کہ کتنی شرم ناک بات ہے کہ ذوقی کے حزار پر ایک عوامی پیشاب خانہ بنا دیا گیا ہے۔ کورٹ نے ہدایت دی کہ یہ مقبرے ملاو عائد کے لیے قومی یادگار کے طور پر محفوظ رکھے جائیں۔ رٹ پیشین کسی اردو ادارے کی طرف سے نہیں بلکہ

عالم کا حرار ہے توئی کا ۱۵

معلومات کے مشہور وکیل ایم ایس سی سہو نے دائر کی تھی۔ سپریم کورٹ کے اس فیصلے سے اردو دنیا میں ہلچل مچ گئی اور ان لوگوں کے چہرے سے غائب الٹ گئی جو عالم کے نام پر اردو کا استیصال کر رہے ہیں۔ اگر ترقی اردو بورڈ، عالم اکادمی، انجمن ترقی اردو، دلی اردو اکادمی، اور ملک کی دوسری اردو اکادمیاں حرار عالم کی تجدید و توسیع کے لیے ذرا بھی متوجہ ہوتیں تو حرار عالم کی شاعرانہ قیمرات ضروریات کے مطابق بن گئی ہوتیں۔ یہاں یہ کہنا مناسب ہے کہ راقم الحروف پہلی بار ۱۹۵۸ء میں لکھنؤ گیا تھا تو میر انیس کا مقبرہ جو ایک کمرے میں تھا، بالکل کھنڈ ہو چکا تھا۔ خدا پر و فیض مسعود حسن رضوی کو مغفرت کرے کہ انہوں نے پہلے مرحلے میں انیس کے دولت خانے کو کنستوین کی تحویل سے چھڑایا اور میر انیس کے مقبرے کو از سر نو تعمیر کر کے اس کو ایک خوب صورت روئے میں تبدیل کیا۔ اس تعمیر کے لیے اور لوگوں کے علاوہ بخشی غلام محمد مرحوم وزیر اعظم کشمیر نے سید علی جواد زیدی کے توسل سے مالی امداد سے نوازا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر ملک صادق نے اس کی طرف توجہ کی اور ۱۹۹۲ء میں میر انیس انٹر نیشنل سمینار کی رسم افتتاح یہیں انجام دی تھی۔

حواشی

۱۔ چارے لال شاکر: مشہور تھی لالاکاں جٹا کداری انہی کی لڑائی تھی۔ پیر پٹنہ میں ۱۳ مارچ ۱۸۸۰ء کو پیدا ہوئے اور ۲۰ فروری ۱۹۵۲ء کو انتقال کیا۔ پیر گنج دلی کے قریب جٹاں میں دفن کیے گئے۔ شاعری میں شوکت میرٹھی کے شاگرد تھے۔ عالم کے تخلص پر کتابوں میں تھے۔ گھٹو سے مارچ ۱۹۳۳ء میں اپنا لڑائی اردو رسالہ ”پنھن“ کے نام نکالا جو پانچ سال تک زندہ رہا کہ جنوری ۱۹۱۸ء میں دم توڑ گیا۔ شاکر اچھے شاعروں میں سے تھے اور انہوں نے اردو کی انہی خدمت انجام دی۔

۲۔ میر عالم دہلوی: اردو کے مشہور ادیب، شاعر اور صحافی تھے۔ اردو کے مشہور محقق اور ناقد ڈاکٹر جمیل جالبی انہی کے بھتیجے ہیں۔



دیوانِ غالب کی اولین شرح

”وثوقی صراحت“

پروفیسر عبدالقادر سرحدی نے اپنے ایک مضمون ”غالب کی شرحیں“ میں غالب کی اولین شرح لکھنے کا سہرا احمد حسن شوکت میرٹھی کے سر پاندھا ہے۔ اس بارے میں انہوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ لہذا ہماری رائے میں یہ روایت مستحسن نہیں ہے۔ شوکت میرٹھی نے اردو کا ایک رسالہ ”پردانہ“ کے نام سے جنوری ۱۸۹۵ء میں میرٹھ سے جاری کیا۔ اس کے حصّہ و رسالے ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ ”پردانہ“ کے بعد کے شماروں میں شوکت میرٹھی نے کلام غالب کی شرح بالاقلام شائع کی۔ اگست ۱۹۰۲ء کے شمارے میں موصوف نے صفحہ ۳۶ میں پہلی مرتبہ اعلان کیا:

علمِ کلیاتِ اردو مرزا غالب۔ اب یہ علم کتابی صورت میں
 ہو تو ہمیں دیکھیں چھپ کر شائع ہوا۔ اخباروں میں اس کی دھوم
 ہے۔ میں ناظرین ”پردانہ“ بھی ایک ایک جلد ضرور منگوائیں۔
 قیمت بھی کم ہوگی ہے، یعنی صرف ایک روپیہ۔

ہماری رائے میں دیوانِ غالب کی اولین شرح لکھنے کا شرف حیدرآباد دکن

مَا قُلْ وَدَلْ خَيْرٌ أَمَّا كُذُّوَالْهَى

سبحان شد و پند
 اردو دیوان غالب کی شرح
 بطور ناز و پائیز و مفید تہیان

و ثوق صراحت
 جسکو

دبستان جنوری کے استاد و کامل حضرت مولانا سرلوسی
 محمد عبد العلی المتعلق والد (رحمۃ اللہ علیہ) نے تصنیف فرمایا

باہتمام وزیر علی ہسٹری مطبع

مطبع ناظم نظامی قہر آباد دہلی

دعایِ غالب کی اولین شرح

کے ایک عالم جید اور شاعر ہاکمال مولوی عبدالعلی تھکس والد کو حاصل ہے۔ کتاب نادر و نایاب ہے۔ اس کا ایک کھل نسخہ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں ہمارے مطالعے میں رہا تھا۔ تفصیلات بعد میں درج کی جائیں گی۔

والد کے حالات زندگی دستیاب نہیں ہیں۔ ان کے والد بزرگوار کا نام مولوی محمد مہدی تھا۔ وہ بھی عالم و فاضل اور قاری کے اچھے شاعر تھے۔ والد انہی کے گھر میں ۱۲۳۸ ہجری (۱۸۳۲ء) میں شہر عداس میں پیدا ہوئے۔ ۱۵۰۰ حیدرآباد میں پروان چڑھے۔ پھر عرصہ وارزنگ نظام کالج حیدرآباد میں پروفیسر رہے اور بی۔ اے کے طلبہ کو مرزا غالب پڑھاتے رہے۔ قاری کے ایک قادر الکلام شاعر اور زبردست شخصیت کے مالک رشک علی شاہ ترقی قندر نور علی اپنے تذکرے میں والد کے بارے میں لکھتے ہیں:

عالم مختصر بود و با شعر قاری خصوصیت داشت۔ مردم ایران و ہندوستان اس مجمع صفات را معدی دکنی می گفتند۔ عرصہ بہت و بہت سال می شود کہ شبہ در مشاعرہ کلام نواب از دور دیدہ بودم۔
مرد معمر معلوم می شود، مگر با ہم گفتگو نہ شدہ ۲۵۰

والد کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی کچھ کتابیں سالار جنگ میوزیم میں موجود ہیں۔ ان میں دیوان قاری قاضی ذکر ہے۔ یہ ۲۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں سولہ صفحوں کے دو جز شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں سلطان العلماء و اشعرا آقا سید علی صاحب شومتری تھکس طوٹی کا گرانقدر مقالہ عربی اور قاری میں بغیر کسی عنوان کے مقدمے کے طور پر درج کیا گیا ہے۔ اس میں والد کی شعری خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ دیوان والد مطبع فخر نظامی واقع حیدرآباد میں باہتمام وزیر علی مالک مطبع، ۱۱۰۲ قندہ ۱۳۱۲ ہجری (مطابق اپریل ۱۸۹۵ء) شائع ہوا۔ دیوان والد کے ساجزائے مولوی محمد عبدالواحد تھکس داہد اور ان کے ایک عزیز محمد عبدالولی نے مرتب کیا تھا۔ سولے میں فیض محمد خاں ریحانی نے اردو میں تاریخ طبع کی:

دیوانِ غالب والدِ مرحوم کا چمپا
ہج تو یہ ہے، جان فصیح و بلیغ ہے

من کر بھی دہاں سے اہل کمال کے
تاریخ کلمہ ”زبان فصیح و بلیغ ہے“
(۱۸۹۳ء) ۱۳۱۱ھ

واحد نے دیوانِ والد کا تاریخی نام ”چندستان بہشت“ رکھا تھا۔ اس سے والد کی تاریخ وفات اور ترمیمِ دیوان کی تاریخ یعنی ۱۳۱۱ کے اعداد نکلتے ہیں۔ دیوان میں ۹ قصیدے، ۴ مرثیے، ایک نثر، ۱۳۲ قطعات، ۱۹۳ رباعیات کے علاوہ غزلوں کے ۳۳۳۸ شعر ہیں۔ ایک منت بند بھی ہے۔

والد نظم کی طرح نثر میں بھی قدرت رکھتے تھے۔ ان کی نثری کتاب کا نام ”گلستانِ نثر“ ہے۔ یہ تاریخی نام ہے اور اس سے ۱۳۱۱ کے اعداد نکلتے ہیں۔ اس میں ۱۷۳ قطعات ہیں۔ ابتدا میں ۱۳ صفحوں کا دیباچہ ہے۔ اس کے بعد نواب محبوب علی خاں نظام دکن کی تعریف میں ایک قصیدہ ہے۔ پھر والد کے انتقال کے سلسلے میں لوگوں کے تعزیت نامے درج ہیں۔ والد پاکستانی انقلاب پر دانا تھے۔ کتاب ۲۶۶ صفحات پر مشتمل ہے اور مطبع عزیز دکن میں ۱۳۱۱ء میں شائع ہوئی۔

والد کا انتقال ۶۳ برس کی عمر میں ۱۳۱۱ ہجری (مطابق ۱۸۹۳ء) میں حیدرآباد میں ہوا۔ بہت سے لوگوں نے وفات کی تاریخیں کہیں۔ قاری کے مشہور شاعر اور نظام دکن کے استاد غلام قادر مرحوم ٹھکس گمراہی نے ذیل کی تاریخ کہی:

والد آں طغر خطہ مداس
اے گمراہی گمراہی غافلِ نرد
با ہر دانش خواں محقق
در دکن انوی ثانی نرد
آب و رنگِ خن لہامہ انوس
بلیلی گلشنِ سحانی نرد
در خن بھولے من او بود
آدخ آدخ کہ پار جانی نرد

دفتر و خامہ را بآب انوار
کان شہنشاہ خوش بیانی نرد
سال سرکش ز روئے ماتم چوست
شاہ الکیم ککتہ دانی نرد

اردو اور فارسی کے شاعر سید فرخندہ علی نقیص طاہر نے اردو میں یہ تاریخ

لکھی۔ ۳۵

عازمِ جنت ہوئے جب والدِ حسنِ سخن
شاعرِ نغمہ مولوی عبدالحی
کی رقم تاریخ طاہر نے، من اے عبدالحی
بجِ جنت میں ہیں قلمِ مولوی عبدالحی
۱۳۱۱ ہجری

شرح دیوانِ غالب

یہ دیوانِ غالب کی اولین شرح ہے جیسا کہ سرورق سے معلوم ہوتا ہے اس کا تاریخی نام "ذوقِ صراحت" ہے۔ جس سے ۱۳۱۱ ہجری کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ اس کا ایک نسخہ زیر نمبر ۱۹ سالہ جنگ میڈیکم حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ شرح آج سے ۱۱۰ سال قبل شائع ہوئی ہے۔ سرورق پر ذیل کی عبارت درج ہے:

اردو دیوانِ غالب کی شرح، بطور تازہ و پاکیزہ مفید مضامین، جس کا تاریخی نام ہے "ذوقِ صراحت" جس کو دبستانِ سنخوری کے استاد کمال حضرت مولانا مولوی محمد عبدالحی ۱۳۱۱ھ تکمیل پہ والد نے تصنیف فرمایا ہے۔ باہتمام و زیرِ قلمِ مطبعِ نای نغمہ نقای واقع حیدرآباد دکن میں طبع ہوئی۔

اس کے بعد واہد کا دیباچہ ہے۔ واہد والد کے بیٹے تھے۔ انھوں نے

شرح شائع کی۔ لکھتے ہیں:

ظاہر ہو کہ اس خاکسار کے دلیو مرحوم جب نظام کالج میں لی۔ اے کلاس کو اردو دیوان مرزا غالب پڑھاتے تھے تو اس کے مقامات پر، جن کو شرح طلب جانتے تھے، ایسے مشکلات پر، جن کو حل کے قابل سمجھتے تھے، شرح اور حل لکھ دیتے تھے۔ چاہے تھے کہ نظر ثانی کے بعد... عالی جناب نواب عماد الملک بہادر عالم تعلیمات... کے جناب فیض مآب میں اس شرح کو پیش کریں، لیکن تقضار مرضی دق سے بہار ہو کہ اس جہان فانی سے عالم باقی کی طرف انتقال کر گئے۔ لہذا یہ ارادہ پورا نہ ہوا۔ اگرچہ اس شرح پر نظر ثانی نہیں کی گئی لیکن نظر اول ہی میں جو کچھ لکھا ہے، نہایت نفیست اور قابل قدر ہے۔ کیوں کہ ایک فرد کامل، سخن گو، سخن دان، سخن فہم اور مسلم الثبوت استاد کی تصنیف ہے۔ اختصار کے ساتھ دقت کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ مقصود قاطبی فوت نہ ہو، لیکن فوذا کہیں غرض و جاتل سے طالب اعلم کے ذہن نہیں ہو جائے۔ حضرت مرحوم کی یہ عادت تھی کہ شرح کو بلا ضرورت ہرگز طول نہیں دیتے اور فرماتے تھے کہ شرح مختصر و مفید ہونی چاہیے۔ اب مجھ کو جو مرحوم کے دیوان اور اشعار کے چھپانے سے فرصت ملی تو اس شرح کو بھی صاف لکھ کر اور اس کا تاریخی نام ”ذوق صراحت“ (۱۳۱۱ھ) رکھ کر بغرضی افادہ چھپایا۔ امید ہے کہ مقبول خاص و عام ہوگی۔

دیوان غالب کی یہ شرح واجد نے اپنے والد والدہ کی وصیت کے مطابق شائع

کی۔ وہ ”خاترہ“ میں لکھتے ہیں:

ایں شرح دیوان اردو، شاعر نازک خیال، صاحب کمال بلند پایہ

دیوان غالب کی اولین شرح

مرزا غالب... مصنفہ فخر الشارحین... حضرت مولانا مولوی شیخ عبدالحی
التفکص بہ والدہ دکنی المدداسی المولود حیدر آباد... بہ جدہ وجہدہ بلخ شاعر
ادیب صاحب اللغات و الناقب مولوی عبدالواحد... عطف
الصدیق حضرت شاربہ مرحوم بحسب وصیہ شاربہ منظور... بحلیہ
طبع مزین کرید۔ ۵۵

مرزا محمد تقی تفکص تقی نے تارخ طبع کی:

اے تقی طبع ہوئی حضرت والدہ کی وہ شرح

جس کے سب اہل سخن تھے بدل و جاں غالب

طبع کا سال لکھا میں نے یہ حقوق میں

للہ الحمد ہوئی شرح کلام غالب ۶۵

کتاب میں کل ۱۹۲ صفحات ہیں آخری صفحے میں واہد کا لکھا ہوا سال طبع
ہے۔ غزلیات کی شرح ص ۱۸۰ میں ختم ہوتی ہے۔ اشعار کی تعداد ۱۱۳۲ ہے۔ آخری شعر
یہ ہے:

ادائے خام سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

ص ۱۸۱ اور ص ۱۸۳ تک ”شرح بعض ایات قصائد“ ہے۔ اس میں ۱۶ شعر
کی شرح ہے۔ اس طرح کل اشعار کی تعداد ۱۱۳۸ ہے۔ غامدہ الطبع کے بعد کئی
تاریخیں ہیں۔

غالبہ والدہ کے پیش نظر شرح لکھتے وقت دیوان غالب کا دوسرا ایڈیشن مطلوبہ
۱۸۳۷ء رہا ہوگا۔ اس ایڈیشن میں بھی کم و بیش اتنے ہی اشعار ہیں۔

والدہ کی شرح دیوان غالب بڑی مفید اور کارآمد ہے۔ اس میں بعض اشعار
کے صرف مشکل الفاظ کے معنی لکھے گئے ہیں۔ جو آسان اور عام فہم شعر ہیں ان کی
شرح درج نہیں کی گئی۔ بعض اشعار کا پس منظر اور تلمیحات بھی بیان کی گئی ہیں۔ مثال

کے طور پر ذیل کا شعر قابلِ توجہ ہے:

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں

کہے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

شعر کی تشریح میں قرآنی آیت کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جاء الحق... کان زحواً،

یعنی حق آگیا اور باطل مٹ گیا ہے۔ باطل مٹنے کے قابل تھا۔ عظیم اسلام نے کہے کو

بتوں سے پاک کیا تھا۔

اردو کے مشہور صحافی، شاعر اور ادیب غوثی نوبت رائے نے فکر نے اپنے رسالے

”خدمتِ نظر“ لکھو میں والد کی شرح کا تہرہ الفاظ ذیل میں کیا تھا:

اس نام کی ایک شرح کلیاتِ اردو مرزا غالب اکبر آبادی مرحوم

حال ہی میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی ہے، اور اس پر ہماری

رائے طلب کی گئی ہے۔ ہم غالب کے دیوان کو حل طلب نہیں

بلکہ تہرہ طلب خیال کرتے ہیں، اور متنی ہیں کہ ملک میں کوئی

ایسا پیدا ہو جو غالب کے کلام کی نزاکتیں اور اس کے حکیمانہ

خیالات پر ایک مبسوط تہرہ تیار کرے، لیکن جب تک یہ نہیں ہوتا

اس وقت تک ایسی شرحیں بھی قیمت ہیں جو لفظی معنی سمجھا سکتی

ہیں اور غالب کے دقیق کلام کو عام فہم بنا سکتی ہیں۔

والد کے فرزند محمد عبدالواحد نقویں والد بھی قاری اور عربی کے جلیل القدر

استاذہ میں تھے۔ وہ حیدرآباد دکن ہائی اسکول علاقہ سرکار نظام میں فارسی پڑھانے جاتے

تھے۔ وہ بھی باپ کی طرح غالب شناس تھے اور غالب کے دیوانِ اردو کی قاری شرح

”دیوانِ تحقیق“ کے عنوان سے حصہ اول میں مرتب کی۔ انیسویں صدی کے حالات

بھی دستیاب نہ ہو سکے۔ ان کے بارے میں ترکی لکھتے ہیں:

واجد نقویں صاحب مولوی عبدالاعلیٰ والد مرحوم حیدرآبادی۔ شاعر

جدیدت و صاحبِ علم و صاحبِ دیوانِ قاری۔ بافقیر شناسائی دارند۔

دوسرے بار در مشاعرہ عبداللہ خاں حنیف ملاقات شدہ۔ بسیار صاحب
علاق و ادب نظر آمد۔ ۸۵۵

واجد نے دیوانِ غالب کی فارسی شرح لکھ کر اپنے باپ والد سے سبقت
حاصل کی۔ بہت سے لوگ واجد کے نام سے ناواقف ہیں۔ غالباً وہ پہلے شخص ہیں
جنہوں نے آج سے قبل ایک سو سال غالب کی منضبط شرح لکھی۔ ”دیوانِ تحقیق“
کلامِ غالب کی فارسی شرح ہے جو صرف ردیف الف پر مشتمل ہے۔ غالب کی ایسی
تفصیلی شرح کسی نے نہیں لکھی ہے۔ ایک ایک شعر کی تشریح کئی کئی صفحات میں کی
ہے۔ تائید میں فارسی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ کتاب غالبیات میں بڑی اہم اور
مطلوبات افزا ہے۔ جو کام والد سے نہ ہو سکا، وہ بیٹے نے بخیر و خوبی انجام دیا۔ مثل
مشہور ہے:

اگر پدر تو اندہ ہر تمام کند

”تحقیق و دیوان“ حصہ اول (ردیف الف) مطبع فجر نکلائی حیدرآباد دکن میں
آج سے لگ بھگ سو سال پہلے ۱۳۱۹ ہجری مطابق ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔ ابتدا کے
۲۳ صفحات میں حیدر اساتذہ کی تاریخیں درج ہیں۔ ان میں سید محمد کاظم حسین کنتوری
تخلص شیفتہ، میر نوازش علی لعل، میر یار علی اعظم قابل ذکر ہیں۔ صفحہ ۳۳ سے ۴۱ تک
صحت نامہ درج ہے۔ اس کے بعد نئے سرے سے صفحات کے نمبر ڈالے گئے ہیں۔ صفحہ
سے ۱۳۷ تک غالب کی ردیف الف کی شرح اس طرح بیان کی گئی ہے کہ کوئی گوشہ
نقص نہیں دکھایا گیا۔ پہلا اور آخری شعر یہ ہیں:

فکرت فریادی ہے کس کی شوئی تحریر کا

کافری ہے بزمین ہر حکم تصویر کا

بخشے ہے جلوہ گل ذوق تماشا غالب

چشم کو چاہیے ہر رنگ میں دا ہو جانا

سید محمد کاظم حسین شیفتہ کی ”شرح دیوانِ اردو کے غالب موسوم بہ دیوان

تحقیق کی تاریخ طبع سنہ ۱۹۷۹ء میں موجود ہے:

جب مشرح ہوا اردو دیہی
اور روشن ہوا عام غائب
شرح یہ والدہ و ماجد نے لکھی
جس سے ظاہر ہو مرام غائب
تحریر سال میں حقوق حروف
اب لکھی شرح کلام غائب ۱۹۷۹ء
(۱۹۷۹ء)

حوالے

- ۱۵۱ دیہی غائب طبعی فر لکھی، سنہ ۱۹۷۹ء
- ۱۵۲ سنہ ۱۹۷۹ء میں طبع شدہ سنہ ۱۹۷۹ء میں طبع شدہ سنہ ۱۹۷۹ء میں طبع شدہ
- ۱۵۳ دیہی غائب
- ۱۵۴ دیہی غائب
- ۱۵۵ "حقائق مرام" سنہ ۱۹۷۹ء
- ۱۵۶ "حقائق مرام" سنہ ۱۹۷۹ء
- ۱۵۷ "حکایت لکھی" لکھی، سنہ ۱۹۷۹ء
- ۱۵۸ سنہ ۱۹۷۹ء میں طبع شدہ سنہ ۱۹۷۹ء میں طبع شدہ سنہ ۱۹۷۹ء میں طبع شدہ
- ۱۵۹ دیہی تحقیق سنہ ۱۹۷۹ء میں طبع شدہ سنہ ۱۹۷۹ء میں طبع شدہ



ناصر علی سرہندی و مرزا غالب کے متحد المضامین اشعار

مرزا غالب کی تاریخ ولادت (۱۲۱۲ھ) سے ۱۰۴ سال قبل ناصر علی کی وفات ہو چکی تھی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قبل میں ناصر علی کے مختصر حالات درج کیے جائیں:

میاں شاہ ناصر علی نام اور علی بخش۔ ولید گمراہ کا نام حبیب علی تھا اور وہ عالی بخش کرتے تھے۔ ناصر علی پنجاب کے سادات میں سے تھے۔ ان کی ولادت پنجاب میں سرہند کے قصبے میں ہوئی تھی۔ تذکرہ نصر آباد میں انھیں کشمیری بیچلہ (غلام) کہا گیا ہے جو درست نہیں۔ وہ سید تھے اور ان کی سیادت پر خود ان کا یہ شعر دال ہے:

گر از حسب ہری ما قہریم قہر

در از نسب ہری ما آل مصطفی ایم ۱۵۱

مولوی قدرت اللہ گوپاموی لکھتے ہیں کہ موصوف "سر آبد فصحاءے روزگار و سر حلقہء بلخائے نامدار" تھے۔ ان کی غزلیں تازگی مضامین کے اعتبار سے بحر ساسری اور ششویاں تکسب الفاظ کے لحاظ سے جادوگری نظر آتی ہیں۔ ۱۵۲ مکتوب "کلمات اشعرا"

ناصر علی کو "آبروے ہندوستان" کہتے ہیں اور ان کی شان میں یہ رباعی لکھی ہے:

وہ ملکب خن یو جہاگیر علی
وہ شرب دل ولی علی میر علی
با صر علی نمی رسد صر کے
نہ انساں کہ خطا کس بہ خطا میر علی

ناصر علی بڑے خوش خیال ، عالی امت ، دولت استغنا سے مالا مال اور بے باک مرد قلندر تھے۔ ۱۱۱ ہجری میں لشکرِ عالمگیری میں شامل ہوئے۔ ملازمت کے وقت بادشاہ کے مصالحتی کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس پر بادشاہ برہم ہوا اور کہا کہ تم فقط شاعر ہو اور آداب سے بے بہرہ ہو۔ بادشاہ کے یہ کلمات سن کر ناصر علی رنجیدہ ہو کر وہاں سے لوٹے اور نواب ذوالفقار خاں نصرت جنگ کے ملازم ہوئے۔ پہلی ہی ملاقات پر غزل کا یہ مطلع پیش کیا:

اے شانِ حیدری ز ہمین تو آشکار
نام تو وہ نبرد کند کار ذوالفقار

نواب یہ سن کر بہت خوش ہوا اور انھیں خلعتِ فاخرہ، ایک ہاتھی اور تین سو روپے نقد انعام میں دیے۔ ناصر علی نے وہ ہاتھی اور زور کثیر رملہ ایکار میں اپنے ہاتھ سے چھڑا کر لیا۔ دوسرے دن وہ خلعت بھی ایک شراب فروش کی دکان پر جام کے عوض پیش کر دی۔ بیگونت رائے چھس قلندر، جو راتے چند بھان کے داماد تھے، خوشگلو سے نقل کرتے ہیں کہ ایک دن وہ اور کوئی دوسرا آدمی ناصر علی کے ساتھ رتھ میں سوار ہو کر دہلی کے بازار میں جا رہے تھے۔ راستے میں دیکھا کہ ایک سبزی فروش اپنی حسین و جمیل بیوی کے ساتھ برسرِ پیکار تھا۔ ناصر علی یہ دیکھ کر اچانک رتھ سے کودے۔ ہمیں یہ خیال ہوا کہ شاید حاجبِ بشری کی رفع کے لیے اترے۔ وہ آہستہ آہستہ اس سبزی فروش کی خوشامد کے کہہ رہے تھے کہ ایسی تازمین لور پری پیکر کو گھوڑوں اور گدھوں کے حوالے کرنا کمال ہے جدی لور نامرادی ہے۔ اگر تم اس سے بیزار ہو تو میرے حوالے

کردہ۔ میں آدم زاد ہوں، اور میں نے کیا قصود کیا ہے۔ بہتری فروش اور راہ چلنے والے حیرت زدہ ہوئے اور اس طرح میاں بیوی کا بھگڑا آگن واحد میں ختم ہو گیا۔

آخر عمر میں ناصر علی حضرت بوعلی قلندر کی دوستی کا دم مارنے لگے۔ آخر کار ۱۱۰۸ھ کو انتقال کیا، اور حضرت نظام الدین اولیا کے مقبرے کے پاس ہی پرہ خاک کیے گئے۔ سرخوش نے تاریخ وفات لکھی:

دارست علی بہ عشق بے پدا
از راحت و رنج دہر مستغنی رفت
دام چوں تو چشم سوے معنی بود
دل کند و ز صورت کدہ ہستی رفت
سرخوش ز خرد سال و فاقش پرسید
گفت "آہ علی بہالم معنی رفت"

۱۱۰۹ھ ہجری

مرزا عبدالقادر بیدل کا یہ مازہ تاریخ ہے جس سے ۱۱۰۸ھ نکلتے ہیں:

دیکھ باز گھست ۳۵۷

ناصر علی سرہندی اور مرزا غالب کے کچھ متحہ الحائین اشعار ایک قلمی کتاب میں مجھے مل گئے تھے۔ غالب راجا صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں کسی ہاذوق شخص نے دیوان ناصر علی میں ایک سادہ ورق پر لکھے تھے۔ کتب خانے میں دیوان کے کئی قلمی نسخے موجود ہیں۔ دو دیوان مصنف کی زندگی میں لکھے گئے اور ایک ۱۱۱۸ھ ہجری کا مکتوب ہے۔ کچھ قلمی مثنویاں بھی ہیں۔

دیوان باکمال شعرا کے متحہ الحائین اشعار دیکھ کر مجھے یاس یگانہ چنگیزی کا وہ مضمون یاد آتا ہے جو انھوں نے "سرقہ، قزاق، تربہ" کے عنوان سے "عزّون" میں شائع کرایا تھا۔ جس میں انھوں نے غالب کے چند اشعار معروف پر سرقے کا الزام لگایا تھا۔ اس سے بعض لوگ نہ صرف یاس یگانہ کے خلاف ہو گئے، بلکہ "عزّون" کے ایڈیٹر

ناصر علی سرہندی و مرزا غالب کے حوالہ جات

تاجور نجیب آبادی کی مخالفت بھی کرنے لگے۔ وہ ”مخزن“ (جلد ۳، نمبر ۷) بابت اکتوبر ۱۹۱۷ء میں ”مخزن“ میں لکھتے ہیں:

گزشتہ نمبر میں حضرت یاس لکھنوی کا مضمون ”قوارو، ترجمہ، سرقت“ کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون میں صاحب موصوف نے کچھ غالب پر لے دے کی تھی۔ اس پر بہت سے اہل قلم مجھ سے ناراض ہو گئے کہ کیوں تم نے یہ مضمون شائع کیا۔ میں نہ حضرت یاس کا اتنا نیاز مند ہوں کہ اگر وہ کسی کو غواہ بخوادہ مورد طعن بنائیں تو میں انہیں داد دوں، نہ غالب مرحوم کے خاندان سے مجھے کسی قسم کی کاوش کہ خدائی فوج دارین کران کے ہتنام کرنے کے درپے ہو جاؤں۔ انھوں نے معقولیت کے پیرائے میں غالب مرحوم پر کچھ الزام لگائے تھے۔ ”مخزن“ کسی خاص پارٹی سے حلق نہیں ہے۔ میں نے مضمون شائع کر دیا۔ اب اگر کوئی صاحب اس مضمون کی تردید میں کچھ لکھیں تو میں اسے بھی شائع کرنے کو تیار ہوں۔ بشرطے کہ محتات کے پیرائے میں تردید کی جائے۔

ذیل میں ناصر علی سرہندی اور مرزا غالب کے وہ اشعار درج کیے جاتے ہیں جو متحدہ العلامین ہیں۔ غالب کے اشعار یاس یگانہ کے بیان کی تائید کرتے ہیں جس میں غالب پر سرتے کا الزام لگایا گیا تھا۔

۱۔ علی سرہندی اے ز حیرت خستہ از چشم غزالاں خواہا
سینہ را از صحن بیداو تو فتح الباہا
غالب نہیں ذریعہ راحت جراحب بچاں
وہ زخم چلے ہے جس کو کہ دل کشتا کہے
۲۔ علی بلکہ از ذکر تو گرویدم جی از خوبصورتی
چوں گلشن ہر قطرہ خونم بے از نام تو شد

- غالب
دو بیت خانہ بیدار کاوش ہے مڑکاں ہوں
کھینچ نام شاہ ہے میرے ہر قطر خون میں
- ۳۔ غلی
اگر بظاہر من کوہ ہم نہاں گرو
شرارہ از رگ خارا چو خوں رواں گرو
رگ رنگ سے چپکا وہ لہو کہ بحر نہ تھا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
- ۴۔ غلی
صدائے خندہ گل طرفہ شوخی داد
کہ از شکوہ گل شاخ پندہ در گوش است
آمد سیلاب طوقان صدائے آب ہے
نقش پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی چادر سے
- ۵۔ غلی
شب کہ از کیفیت نے برقی صفت تاب داشت
از فلک رگ گل سخن جان مہتاب داشت
شب کہ برقی سوز دل سے زہرہ از آب تھا
شعلہ جوالہ ہر اک حلقہ کرداب تھا
- ۶۔ غلی
چہ شد کہ شاہ بر افروخت شمع کافوری
چراغ خانہ درویش ماو تاہاں است
زکوۃ حسن دے اے جلوہ بخشی کہ مہر آسا
چراغ خانہ درویش ہوں کار گدائی کا
- ۷۔ غلی
آب چوں در روشن افتد تالہ خیزد از چراغ
صحت ما جنس را باشد شر آزاد ہا
آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درمانگی میں تالے سے دوچار ہے

حوالے

- ۱۵۱ سلیم فورگھرسلو پندرہویں دہائی فورگھر، سال الحلیف ۱۳۷۷ھ، مرتبہ پروفیسر مظاہر علی گامی
- ۱۵۲ "نئی نچ اور گورنہ" ص ۳۷۴
- ۱۵۳ "سلیم فورگھر" ص ۴



غالب کے ایک معترض (یاس یگانہ چنگیزی)

اردو کے نام وَر شاعر اور فنی عروض و بیاں کے صاحب کمال استاد مرزا یاس ۱۳۰۱ ہجری (مطابق ۱۸۸۳ء) میں عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں انگریز پاس کیا۔ شاعری میں سید علی چٹاب (متوفی ۱۹۳۸ء) سے تلمذ حاصل تھا۔ ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ میں مرزا محمد شفیع شیرازی کی صاحب زادی کے ساتھ عقد نکاح ہوا۔ شیرازی صاحب مشہور ادبی کتاب ”معرکہ شرر و چمکست“ مطبوعہ ۱۹۱۳ء کے مرتب تھے۔ نواب عسکری قلیغ نے سہرا کیا۔ تاریخی شعر یہ ہے:

لکھتے ہیں بھر یاد سہ بھوسی بلخ

ہے جشن عقد یاس کا مہ نظر کہیں

یاس ہمیشہ مغلیں کی زندگی گزارتے رہے۔ زندگی کے آخری کلام موت و دہشت کی کش مکش میں کٹ گئے۔ ان کے ساتھ بڑی بدتمیزی کی گئی۔ اس الم ناک اور ناخوشگوار واقعے کے بارے میں اپنے بیٹے کو ۲۹ اگست ۱۹۵۳ء کے خط میں لکھتے ہیں:

آخر کار اہل محلہ نے مجھے گھر سے نکل جانے پر مجبور کیا۔ گرجہتی کا

غالب کے ایک مسخرے (اس پتہ پر بکیری)

سارا سامان اور اپنی بیش قیمت کتابیں، ”آیات وجدانی“ کی تقریباً پچیس جلدیں، برتن ہاسن، الگ پلنگ میز کرسیاں، سب چھوڑ آیا۔ یاروں نے سب لوٹ لیا۔ نہایت قیمتی مسودات میرے لکھے ہوئے نہ معلوم کن ہاتھوں میں پڑیں گے۔

پاس کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا گیا تھا، اس کی روداد پروفیسر مسعود حسن رضوی اور ایک معزز شخص مرتضیٰ حسین عرف الحسن صاحب نے مجھ سے بیان کی تھی۔ میں ایسے دل دوز اور شرم ناک واقعات یہاں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ آخر کار پاس کا انتقال بڑی کس پھری، درد و کرب اور عالم تنہائی میں ۳ فروری ۱۹۵۶ء کو ہوا۔ میت چار شہدوں نے اٹھائی۔ لکھنؤ کا کوئی آدمی جنازے کے ساتھ نہیں تھا۔ وکٹوریہ کالج، غنشی تعقل حسین کی کربلا میں پرو خاک کیے گئے۔ بعد وفات ان کی بیٹی نے قبر بخوائی، ملاح الحسن صاحب کے مشورے سے لوح قبر پر یہ شعر کندہ کرایا:

خود پرستی کیجیے یا حق پرستی کیجیے
آہ کس دن کے لیے باقی پرستی کیجیے

پاس کی تصانیف نایاب ہو رہی ہیں۔ ادیب مرحوم کے کتب خانے میں ذیل کی کتابیں اور کچھ مسودات میری نظر سے گزرے ہیں:

- (۱) ”نظریہ پاس“: مطبع نورالطالع، لکھنؤ، ۱۹۱۳ء
- (۲) ”چراغ سخن“: مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۲۱ء
- (۳) ”آیات وجدانی“: مطبوعہ شیخ مبارک علی، لاہور، ۱۹۲۷ء
- (۴) ”ترانہ“: مطبوعہ لاہور، ۱۹۳۳ء
- (۵) ”گہینہ“: قوی دارالاشاعت، لاہور، سنہ نگارو
- (۶) ”غالب شکن“: ۱۹۳۳ء

”نظریہ پاس“ کی ابتدا میں سید حامد علی خاں جیرٹر کا ایک مبسوط دیباچہ ہے۔

اس کے علاوہ مشہور شعرا لکھنؤ میر محمد علی عارف، پیارے صاحب رشید، مرزا ادیب، سید

میر کاظم جاوید وغیرہ کی تقریظیں موجود ہیں، عارف لکھتے ہیں:

میرے شفیق دوست، صاحب فضل و کمال، شاعر نازک خیال،
جناب مرزا واجد حسین یاس کا کلام فصاحت و بلاغت کا نام نظر
قاصر سے گزرا اور بعض حالات سے دیکھ کر میں نے پسند کیا اور
بلا زورے رعایتِ حقین کی۔ درحقیقت اساتذہ کی تخیل و زبان کا
صحیح نمونہ ہے، لیکن یہ نسبت اور اساتذہ کے حضرت آفتاب کے
کلام کی گرامری زیادہ پائی جاتی ہے، کیوں کہ جناب یاس نے
تخلیہ بھی خوبصورت صاحب کی ہی اختیار کی۔ یہی واقعہ ہے کہ
اربابِ کمال "نصیر یاس" کو بھر قدر ملاحظہ فرمائیں گے اور
حقین و آفریں کی بیش بہا وسعت دے کر مصطفیٰ ممدوح کا دل
بوسنائیں گے، اس لیے کہ ہر کمال کی ترغی قدر شاموں کی توجہ پر
مختصر ہے۔

ان تقریظوں کا رد عمل یہ ہوا کہ لکھنؤ کے بعض شعراء جیسے معیار نے
("معیار" ایک اردو رسالہ تھا) یاس کے خلاف ایک ادبی محاذ قائم کیا۔ انہی دنوں
طریف لکھنوی نے ایک مشاعرے میں یاس کی موجودگی میں ایک جھوکی۔ یاس صبر و
سکون سے سنتے رہے۔ کچھ دنوں بعد لکھنؤ چوک میں ان کے خلاف ایک اور جھوٹیم کی
گئی، اس کے چند شعر یہ ہیں:

ہام خداوند بالا و پست
سکھم یاس را نیست ہر جا کہ ہست
ہزاراں کہ خواندیم لا محظو
تو بر زبانی یاس ایک تنو
دل کا فرماں چو دوزخ بود
و دوزخ پہ یاس مطبخ بود

غالب کے ایک مضرعہ (پاس بکھڑا)

پاس اپریل ۱۹۳۰ء میں لکھنؤ سے عظیم آباد گئے۔ یہاں ایک مشاعرے میں سات شعر کا غریب قلعہ بنایا۔ یہ قلعہ غالب دہلوی نے اپنے روزانہ اخبار ”ہوم“ لکھنؤ میں شائع کیا۔ اس کے بعد ”مخزن“ لاہور کے اگست ۱۹۳۰ء میں معمولی اختلاف کے ساتھ دوبارہ چھپ گیا۔ منقطع یہ ہے:

لکھنؤ کے فیض سے ہیں دو دوسرے میرے سر

اک تو استاد بیکانہ دوسرے داماد ہوں

منقطع میں بیکانہ شخص درج ہے۔ پاس کے ساتھ بیکانہ شخص کرنے کی بنیاد یہیں سے پڑتی ہے۔ اس سے پاس کے مخالفین اور بھی بھڑک اٹھے اور معرکہ آرائی میں تیزی آنے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پاس نے اپنے حریفوں پر قابو پانے کی غرض سے بعد میں ایک اور شخص ”پنچگیری“ اختیار کیا۔ یعنی اب پاس، بیکانہ، پنچگیری ہو گئے۔ ”نکھر پاس“ کے سرورق پر پاس کا یہ شعر چھپا ہے:

اثر پیدا کیا چاہو سخن میں طرز دل کش سے

تو انداز ہاں نکھو انیس و میر و آتش سے

آگے چل کر کتاب میں ”مابوچ شاعری“ میں پاس میر انیس، میر اور آتش کی خوبیاں بیان کرتے کرتے غالب پر تنقید کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

غالب کے بیان میں محض عقل کی جذبات ہے۔ دیوان بھر میں

تھوڑے سے اشعار ہیں جن کی وجہ سے غالب غالب ہیں (دور)

یہ مختصر سا دیوان بھی ہزاروں پیچیدگیوں اور خامیوں سے بھرا پڑا

ہے) ان پیچیدہ اشعار میں بھی کوئی شعر مشکل سے ملے گا جہاں

قوت تخیل کا تصرف (جیسا کہ میر انیس اور آتش کی مثالوں سے

دکھایا گیا ہے) خیال اور الفاظ دونوں پر یکساں ہوا ہو۔ حاشا اس

سے مطلب یہ نہیں کہ غالب استادانہ حیثیت نہیں رکھتے، لیکن

استادانہ مذکورہ کی حد کمال تک ان کی پہنچ نہیں ہے۔

عالم کے ایک معروض (اس کا نام پتھر)

”نظمِ یاس“ کی اشاعت سے پاکستان کو لینے کے دینے پڑے اور معاصرین ان کا کافیہ نگ کرنے لگے۔ ان میں ”معیار“ کے ایڈیٹر علی حسن خان آبر، مرزا محمد ہادی عزیز، مقلی لکھنوی، مقبول حسین ظریف اور مرزا قاتل بخش بخش تھے۔

۱۹۱۵ء میں یاس نے تاریخی نام سے ”چراغِ سخن“ فنِ عروض پر ایک تصنیف بخش کی جو دسمبر ۱۹۳۱ء میں ”ابوالعالی مرزا یاس“ کے نام سے شائع ہوئی۔ سرورق پر یہ شعر ہے:

مزارِ یاس پہ کرتے ہیں شکر کے مجھے

دعاے خیر تو کیا اہل لکھو کرتے

دوسرے صفحے پر ”اسمعوا فہموا، یاس نام آدم، قاری لکھو“ کے بعد تو

شعر کا ایک قطعہ ”ترانہ ششکوی“ درج ہے۔ مقلع ہنگامہ خیر ہے:

مہم کہ لکھو را جانِ تازہ دادم

مہم خداے سخن و خداے خودم

یاس نے ”چراغِ سخن“ میں عالم، عزیز اور آبر کے کام کو بدلتے تنقید بتایا ہے، عالم کے اس شعر:

میں اور صد ہزار نوا ہاے دل غرض

تو اور ایک وہ نشیدن کہ کیا کہوں

پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

سبحان اللہ! ”نشیدن کہ کیا کہوں“ کی ایک ہی کمی۔ اردو کی

چوٹی ہوئی قسمت جہاں تک تازہ کرے، بجا ہے۔ عالم پرست

قرا گر بیان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ یہ دہلی کی زبان ہے یا کسی

دیو زاد کی۔

عالم کے بارے میں یاس ”ہذاقی کی مثالیں“ میں مزید یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

عالم کی ہذاقیوں اور لکھنوی کی بے احمداہیاں دکھانے کے لیے

غالب کے ایک سترمل (اس کا ترجمہ)

ایک مستقل کتاب چاہیے، اس رسالے میں تجھانش نہیں، مگر تاج
اور غالب کی روش تخیل کی طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری سمجھتا
ہوں اور وہ یہ ہے کہ تاج نے جو کچھ کہا ہے اگرچہ باعتبار غزل
پسندیدہ نہیں ہے مگر مطلب فزا کچھ میں آجاتا ہے اور صحیح الفاظ
و محاورات کے اعتبار سے تاج کے تمام اشعار مستند ہیں۔ گو
دیوان تاج زبان اردو کی ایک دشمنی ہے، مگر غالب کے مختصر
دیوان کا بیش تر حصہ نہ کچھ میں آتا ہے اور نہ باعتبار غزل کوئی
دقت رکھتا ہے۔ بھید انہم خیالات اور بے اعتمادی تخیل کا اچھا
خاص نمونہ ہے۔

یاس کا دوسرا عظیم شاہ کار ”آیات وجدانی“ ہے۔ غزلوں پر کا مجموعہ ۱۹۲۷ء
میں لاہور میں شائع ہوا۔ دوسرے اور تیسرے صفحے کے درمیان یاس کی تصویر بھی
ہے۔ تصویر کے اوپر لکھا ہے:

"A man who knows himself."

اس کے نیچے ایک شعر اور انگریزی عبارت اس طرح ہے:
سراپا راز ہوں میں، کیا تاؤں، کون ہوں، کیا ہوں
سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

"Mirza Yas Ygana

A Living Mind of the East."

کتاب کے تیسرے صفحے پر ذیل کا شعر جلی حروف میں نمایاں ہے:

خود پرستی کیجیے یا حق پرستی کیجیے
آہ کس دن کے لیے تاج پرستی کیجیے

کتاب کے آخر میں لال کور میں یاس کے ہاتھ کا لکھا ہوا اقتباس درج
ہے۔ اصولاً اقتباس ابتدا میں ہونا چاہیے تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پبلشرز نے جان بوجھ

غالب کے ایک سحر (دس پتہ بھاری)

کر اسے آخری صفحے میں شامل کر کے شائع کیا اور مصنف کی رائے کے چار سو روپے بھی مار دیے۔ انتساب کے الفاظ قابل ذکر ہیں:

To

The German Nation, The Staunch
Friend of the Eastern Classics

Mirza Yas Ygana

66, Shah Gunj, Lucknow

6 - 3 - 27

سرورق پر قرآنی آیت ہے، جس کا مضمون ہے ”جلوہ فرما حق ہوا، باطل گیا۔“

یاس کی غالب فکری: یاس اپنے معاصرین کی ”غالب پرستی“ سے بیزار تھے۔ جنوں ان کے، یہ لوگ غالب کی اندھی تقلید کر کے ان کو مہر سے آگے بڑھانے میں رواں دواں تھے۔ حقیقت میں یاس غالب کو ایک اچھا اور پاکمال شاعر سمجھتے تھے اور ان کی شعر گوئی کے اسی حد تک قائل تھے جس حد تک وہ اسے سمجھتے تھے۔ یہ درست ہے کہ بعض معاملات میں انھیں غالب سے اختلاف تھا۔ ”چراغِ سخن“ صفحہ ۳۵ میں لکھتے ہیں:

انہوں نے کہ آج کل ہندوستان میں غالب کے ان عجیبہ انداز (ہائے) بیاں کی تقلید کی جاتی ہے جو معنی و بیاں کی رو سے نہایت معیوب ہیں۔ ہاں، غالب کے وہ چند اشعار جن میں منطق کی شوشیاں، پندریدہ نزاکتیں اور قریب الفہم کھائے پائے جاتے ہیں، ان کی تقلید کی جائے تو بے شک اردو کی شاعری کے لیے نہایت مفید ہے۔ مگر ایسا نہیں کیا جاتا اور یہ کام کچھ آسان بھی نہیں ہے۔ واضح ہو کہ غالب کے وہی چند اشعار پندرہ خاص و عام ہوئے جن میں مذکورہ بالا خوبیوں کے جوہر پائے جاتے ہیں۔ یا جو سادگی و نزاکت کے سیدھے راستے پر ہیں۔

غالب کے ایک سطر (اس پتہ پر)

اسی کتاب کے صفحہ ۳۳ میں لکھتے ہیں:

آج کل ہندوستان میں غالب پرستی کی وہ زہریلی ہوا چل رہی ہے کہ الٹی توپ! انہوں نے کہ لکھنؤ کے بعض حضرات کے دماغ میں یہ ہوا ایسی سائی ہے کہ یہ لوگ خود کو خوش مذاق بھی سمجھنے لگے ہیں، بلکہ اپنے مذاق کے سوا دوسروں کے مذاق کو جھنڈل سمجھتے ہیں۔ جن جلالہ۔ لکھنؤ ایسے شہر کے لیے ایسی بد مذاقی نہایت ہی ننگ کا باعث ہے۔

یاس نے ایسے ہی خیالات کا اظہار اپنے مرثیہ کردہ ماہانہ رسالے ”صحیفہ“

نمبر ۱۹۲۵ء میں بھی کیا تھا۔

انہوں نے کہ اہل وطن کی کوتاہ نظری و غلط فہمی سے میں غالب کا مخالف ہو گیا ہوں، مگر یہ ایسی ہی بے معنی بات ہے جیسے غالب کے بعض بعض اشعار، آج کل ہر کس و نامک نے غالب کی بے جا مدح سرائی کو اپنا فیشن بنالیا، مگر میں اس شخصیت نامکس کو اپنا فیشن بنانا جرم سمجھتا ہوں۔

یاس نے اپنے معاصرین کی غالب پرستی کے خاطر میں ”غالب حکیم“ کے

نام سے ایک کتاب بھی لکھی جو ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ ذیل میں چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں:

(الف) بغض و اعداوت کی قربان گاہ پر وجہ معاش کو بھیجٹ چڑھانا، بال بچوں پر سختیاں اپنی آنکھوں سے دیکھنا اور صبر کرنا، عمر بھر کا سرمایہ ایک اچھا خاصہ کتب خانہ بے روزگاری کے ہاتھوں ننگ آکر کوڑیوں کے مول لٹا دینا۔ اپنی ضمیر پرستی کے ہاتھوں الٹا مورد الزام۔ غالب جیسے خود غرض، پیٹ کے بندے، خلعت کے بھوکے، انگریزوں کے پرستار و فیشن خوار کا کام نہیں ہے۔ (”غالب حکیم“، ص ۱۱)

(ب) کتنی شرم ناک بات ہے کہ عالم نے چار دن بھی بادشاہ کے ملک کا پاس نہ کیا۔ تخت اٹھتے ہی انگریزوں کے وقادان، ملک خوار، قصیدہ گزار بن گئے۔ (صفحہ ۱۲)

(ج) عالم اور وطن پرستی؟ ارے میاں! کہاں کی وطن پرستی، وطن پرستی کا ثبوت تو لکھنؤ کے شہدوں نے دیا کہ داہد علی شاہ بہادر کے معزول ہونے کے بعد مرزا برہمچند کو زبردستی تخت پر بٹھا کر انگریزوں سے لڑتے رہے اور یہاں یہ حال کہ دلی کا راج لٹ گیا۔ بہادر شاہ قید ہو کر رنگون سدھارے۔ کسی کی تکسیر تک نہ پہنچی۔ مرزا وطن پرست کو اپنے طوے ماٹے کی چڑی تھی۔ بڑھاپے میں لاٹ صاحب کے دربار میں شرکت کی ہوں دل میں رہ گئی۔ سلطنت مظاہر کا ملک خوار اور اس کا یہ کردار، لا حول؟ (صفحہ ۲۳)

(د) عالم کے کمالات فن کا معترف ہوں، مگر اسی حد تک، جتنی بھی میرا ضمیر اجازت دیتا ہے۔ میں عالم کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں، پرانی آنکھوں سے نہیں۔ (صفحہ ۳۱)

(ه) عالم کا تو میں مذاق ہوں، لیکن عالم پرستوں نے تمام اساتذہ ماضی و حال کا حق تلف کر کے عالم کو دے دیا ہے، مگر میں نے ہرگز عالم کا حق تلف نہیں کیا، ان کو اردو کا مایہ ناز شاعر مانتا ہوں۔ (صفحہ ۳۳)

جاس ان "عالم پرستوں کے بارے میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

عالم کو تیر سے بڑھانے والے

چندوں کو ہنس پر چڑھانے والے

انہوں کو اپنے ساتھ لے ڈوبیں گے

دنیا کو غلہ سستی پڑھانے والے

دلی میں "عالم حسن" سے چہ رہائیاں ورج کی جاتی ہیں۔ کلی رہائی

میں دونوں بزرگوں کی مشترک چیزیں ملتی ہیں، یعنی دونوں اشاعری اور مولائی کے

عالم کے ایک ستر (اں پکار بکری)

عقیدت مند شاعر تھے۔ چوتھے ستر میں اپنے کو عالم سے افضل سمجھتے ہیں:

دونوں دیوانے ہیں مٹی کے عالم
جان ایک ہے گو جدا جدا ہیں عالم
مذہب میں، شاعری میں، قومیت میں
عالم ہیں بیکاد اور بیکاد عالم

☆

شہزادے چڑے فرنگیوں کے پالے
مرزا کے گئے میں موجوں کے مالے
وہلے گریبان میں منہ ڈال کے دیکھ
عالم کو دہن پرست کہنے والے

بیکاد چنگیزی نے جب ”عالمِ فلک“ کا قسط پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کو بھیجا تھا تو ادیب نے بعض رہامیاں پسند نہیں فرمائی تھیں۔ بیکاد نے، جو اس زمانے میں حیدرآباد میں سب رجسٹر تھے، ادیب کے نام ایک طویل مکتوب ۲۵ دسمبر ۱۹۳۳ء کو لکھا تھا، ذیل میں اس کا ابتدائی حصہ درج کیا جاتا ہے:

آپ فرماتے ہیں کہ آخر کی چند رہامیاں (وہی جن میں عالم پر
تصنیف کیا گیا ہے) شائع نہ کی جاتیں تو اچھا تھا۔ انہیں شائع
کر کے گویا میں نے اپنے بھی خواہوں کا (”بھی خواہ“ بقول آپ
کے) دل دکھایا ہے۔ خیر یوں ہی سہی۔ غلط جہی یا غلط فہمی کے
سبب کوئی آپ پر کا کھا جائے تو اور بات ہے ورنہ مجھے دل
دکھانے کی ضرورت کیا تھی۔ البتہ یہ آرزو ہے کہ ہر کو ہر کی
حیثیت سے جانچنے اور قدر کرنے کی صلاحیت ملک میں کتنی ہے۔
آیا لوگ محض اپنے ہی ہم خیال و ہم مذہب کے ہر کو دیکھ سکتے
ہیں یا غیروں کے بھی۔ میرا مذہب عالم پرستی نہیں ہے، بلکہ خود

پہلی یا حق پہنچی:

خود پہنچی کیجیے یا حق پہنچی کیجیے

آہ کس دن کے لیے باقی پہنچی کیجیے

عالم کا دشمن کون کافر ہے؟ میں تو اُن عالم پرستوں پر قہر کی
بھلیاں گراتا ہوں جو بطور فیشن عالم کے نام کی رٹ لگائے
رکتے ہیں۔ کج پوچھو تو بر غوردار یہ ہمارا مرزا عالم ٹٹ پونجیوں
کے ہاتھ پڑ گیا ہے۔ اس کے اشعار کے وہ وہ معنی نکالتے ہیں جو
عالم کے فرشتوں کے خیال میں بھی نہ آئے ہوں۔ اور میاں
بات یہ ہے کہ امداد شاعری میں میر کے بعد آتش جیسا شاعر پیدا
ہی نہیں ہوا۔ عالم تو بے چارہ زبردستی امداد کا شاعر بن گیا۔

پاکستان پیچیدگی کی 'عالم مخالف' تحریریں عرصہ دراز تک قائم رہیں اور اس کا
جوش و خروش ملک کے طول و عرض میں پھیل گیا تھا۔ ان کے عالم لکھنی کے مضامین
”عزیز“ جیسے معیاری رسالوں میں دلچسپی کا باعث بنتے رہے۔ ”عزیز“ ۱۱۰۰، جلد ۳،
نمبر ۶، اپریل ستمبر ۱۹۷۱ء میں پاس کا ایک معرکہ آرا مضمون ”تواور، ترجمہ، سرقت“ ۱۱۵ء کے
عنوان سے شائع ہوا۔ اس کی اشاعت پر لوگوں نے ”عزیز“ کے ایڈیٹر جناب تاج
نجیب آبادی سے سخت احتجاج کیا، چنانچہ انھوں نے ”عزیز“ کے اگلے شمارے جلد ۳،
نمبر ۷ (صفحہ ۶۵)، اپریل اکتوبر ۱۹۷۱ء میں ”بزم عزیز“ کے تحت اپنا ردِ عمل یوں ظاہر کیا:

گزشتہ نمبر میں حضرت پاس لکھنؤی کا مضمون ”تواور، ترجمہ، سرقت“
کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون میں صاحب موصوف
نے کچھ عالم پر لے دے کی تھی۔ اس پر بہت سے اہل قلم مجھ
سے ناراض ہو گئے کہ کیوں تم نے یہ مضمون شائع کیا۔ میں نہ
صرف پاس کا نیاز مند ہوں کہ اگر وہ کسی کو خواہ تواور، موردِ وطن
بنائیں تو میں انھیں داد دوں، نہ عالم مرحوم کے خاندان سے

عالم کے ایک سحرش (اس جادو نگار)

مجھے کسی قسم کی کاوش کہ خدائی فوج دار بن کر ان کو ہٹام کرنے کے دہپے ہو چاؤں۔ انھوں نے معقولیت کے چراغے میں عالم مرحوم پر کچھ الزام لگائے تھے۔ ”تخون“ کسی خاص پارٹی سے حلقہ نہیں ہے۔ میں نے مضمون شائع کر دیا۔ اب اگر کوئی صاحب اس مضمون کی تردید میں کچھ لکھیں تو میں اسے بھی شائع کرنے کو چار ہوں۔ بشرطے کہ حیات کے چراغے میں تردید کی جائے۔

”تخون“ بابت مئی ۱۹۱۸ء میں پاس کا ایک اور مضمون ”آتش و عالم“ شائع ہوا۔ اس میں ”مسیار“ اور ”عالم“ پر سختوں کی زبردست مخالفت کی گئی تھی۔ اس کے بعد ”تخون“ بابت جولائی ۱۹۱۸ء میں ایک طویل مضمون ”آتش و عالم“ کے عنوان سے آزدہ بیجاپوری کے فرضی نام سے شائع ہوا۔ اس کے طرزِ تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ مضمون پاس کے کاوش نگار کا نتیجہ ہے۔ چند جملے یہ ہیں:

اہل مسیار (مسیار لکھنؤ میں لکھنے والے عالم پرست) خدائے سخن میراثیں اور خوبہ آتش پرستہ آنے لگے اور عالم کی تحقیر کا دھماکے بے جا کرنے لگے تو مجھذا مرزا پاس کو عالم کی قلمی بھی کھولنا پڑی۔ مرزا پاس خود عالم کے مداح ہیں۔ مگر ان حضرات کی حسیہ کے لیے عالم کی شاعری کے محبوب اور آتش کی شاعری کے محاسن دکھانے پر مجبور ہوئے۔ مرزا پاس کو جو عالم کا بہترین مخالف سمجھتے ہیں وہ عالم کسی دماغی مرض میں مبتلا ہیں۔ شاہ دیکھ صاحب مرزا پاس پر یہ جو الزام دیکھتے ہیں کہ ”عالم کو برا بھلا کہا“ یہ بالکل غلط ہے۔ عالم کو ہرگز برا نہیں کہا بلکہ ان کی بیعتان نما شاعری سے نفرت ظاہر کر کے لوگوں کی آنکھیں کھول دی ہیں۔

جب غالب کے خلاف پارس کی مخالفت کا سیلاب زور شور سے امنڈنے لگا تو انھوں نے سر کے کا ایک اور مضمون لکھا جو ”مغزل“ لاہور، بابت جن ۱۹۱۸ء میں ”میرزا غالب اور میں“ کے عنوان سے صفحہ ۴۹ تا ۵۲ شائع ہوا۔ مضمون مفید اور نادر ہے، اس لیے ذیل میں بن و بن درج کیا جاتا ہے:

مرزا غالب مغفور کے حلقہ جتنے مضامین میرے قلم سے نکلے ہیں وہ ہندوستان کے اکثر بزرگواروں کی برہمی خاطر کا باعث ٹھہرے۔ اکثر حضرات کی طرف سے یہ برہمی حق بجانب ہے۔ خصوصاً جناب نواب سعید احمد خان صاحب طالب، نواب شجاع الدین احمد خان صاحب تاپاں اور نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل، جنھیں مرزا غالب مغفور کے ساتھ سلسلہ قرابت کا شرف حاصل ہے، مگر ان بزرگواروں کی شرافت و تہذیب حم کھانے کے قابل ہے کہ باوجود اس برہمی خاطر کے مجھ سے اسی طرح ملتے ہیں جو تہذیب و شرافت کا شکستہ ہے۔ مجھے نواب سعید احمد خان صاحب طالب کی خدمت میں شرف نیاز حاصل نہیں ہے۔ میں اس سال ایک ضرورت سے دہلی گیا تھا، معلوم ہوا کہ حضرت طالب ان دنوں دہلی میں تشریف نہ رکھتے تھے، اس وجہ سے میں شرف حضوری حاصل نہ کر سکا۔ نواب شجاع الدین خاں صاحب تاپاں سے پارساں علی گڑھ کالج کے مشاعرے میں فقہ شامانی سی ہوگئی تھی۔ بات چیت کی نوبت نہ آئی۔ میں نے یہ سنا تھا کہ حضرت تاپاں نہایت بد مزاج اور منہ کے کڑے ہیں۔ اس بات نے مجھے اور بھی آمادہ کیا کہ میں جناب کی خدمت میں حاضر ہوں۔ چنانچہ ایک دن در دولت پر حاضر ہوا۔ بہت دیر تک محبت دہی اور پھر دوسرے دن ان حضرت تاپاں نے مجھے

اپنے دسترخوان پر بھی بلایا اور بعد طعام کئی کھینے تک شعر و سخن کا سلسلہ جاری رہا۔ جناب گرامی حیدر آبادی بھی تشریف رکھتے تھے، مگر میں نے حضرت تاجاں میں بد مزاجی کے آثار کچھ بھی نہ پائے۔ اٹائے گفتگو میں مرزا عالم کا ذکر آگیا تو بس اتنا فرمایا کہ بھی تم تو عالم کے مخالف ہو۔ میں نے عرض کی کہ حضرت میں ہرگز عالم کا مخالف نہیں ہوں جتنا لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے یا بجائے خود سمجھ لیا ہے۔ مگر ہاں، اس مخالف طاہری کے (جو میری طرف سے ظہور میں آئی) کچھ ایسے اسباب ناگزیر ہیں جن کی اطلاع ہر شخص کو نہیں ہے، خاص خاص لوگ واقف ہیں۔ وہ سب اسباب میں نے بیان کیے تو حضرت تاجاں اس مجید کو سمجھے اور خاموش ہو رہے۔ حضرت سائل بھی اس مجید سے آگاہ ہیں اور مکرزی مولانا رحمہ قریشی انصاری اور مکرزی جناب مولوی سید محمد احمد بیچوڑ موہانی بھی آگاہ ہیں۔ یہ دونوں حضرات مؤرخانہ کر میرے سچے دوست اور بھی خواہ ہیں اور حد درجے عالم کے فدائی ہیں۔ عالم کے حلق میں میری خامہ فرسائیوں سے آزدہ بھی ہوئے، مگر چوں کہ یہ حضرات اس فساد کے سبب اقلیت سے باہر ہیں، اس وجہ سے میری مجبور یوں کا اندازہ کر کے خاموش ہو رہے۔ مولانا رحمہ اور حضرت بیچوڑ موہانی کے ساتھ ان کے گہرے تعلقات پر بھی مجھے عالم مظلوم کے خلاف خامہ فرسائی کی جو ضرورت دینی ہوئی وہ لکھنؤ کی ایک نااہل جماعت (معیار پارٹی) کی مسلسل اشتعال انگیزی تھی۔ اس جماعت کے اراکین خاص متقی، عزیز و قاصد ہیں جن کے دل خراش ہڈیاں اک گراموں کے ذریعے سے بہت دنوں تک میرے دل کو ترپاتے

رہے۔ یہ گرامفون 'معیار' مرحوم کا اڈیٹر ہے جس کے واسطے سے ناقابلِ برداشت صداائیں میرے کانوں تک پہنچتی رہی ہیں، جس نے خدائے سخن میرا نہیں اعلیٰ اللہ مقامہ اور غولہ آتش علیہ الرحمۃ کی شان میں کلمات بازیاد کہہ کر میرا کلیجہ پکا دیا۔ میں اس درس گاہ کا تعلیم یافتہ ہوں جہاں سب میرا نہیں، میری قیادت میرا اور غولہ آتش کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ میرے دل میں ان بزرگواروں کی جو عظمت قائم ہے وہ مٹائے نہیں مٹ سکتی۔ غالب کی نسبت میرے جو خیالات ہیں، وہ ہیں۔ اس کی ضرورت نہ تھی کہ اپنے مافی الضمیر کو عالم شہور میں لا کر خواہ کھواہ بھی برہمی پھیلائی جاتی، مگر بعض کوتاہ اندیشانِ لکھنؤ کی سلیبان روش نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس دل آزادی کا انتقام لوں۔ انتقام اگرچہ داخل انصاف ہے مگر وحشیانہ انصاف ہے۔ 'معیار پارٹی' کی اشتعال انگیزیوں نے مجھے آڑکار اس ناگوار خدمت پر آمادہ کیا۔ غالب موقوف کی نسبت جو کچھ میں نے لکھا وہ ایک ناگوار فرض تھا جو مقامی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر طوعاً و کرہاً ادا کیا گیا۔ اس 'معیار پارٹی' کی چشم نمائی کے سوا اور کسی کی دل آزادی مقصود نہ تھی۔ مگر ملک کے اکثر اعلیٰ سخن پر اس کا بُرا اثر پڑا اور پڑنا چاہیے تھا۔ چنانچہ اکثر حضرات نے میری مخالفت میں مضامین شائع کیے، مگر میں نے کسی کا جواب نہ دیا، کیوں کہ میرا ذمہ سخن 'معیار پارٹی' کے سوا اور کسی طرف تھا ہی نہیں۔ جو لوگ مجھے غالب کی شاعری کا بدمعاش مگر سمجھتے ہیں، انہیں اختیار ہے، مگر وہ حقیقت ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ کہوں گا کہ حقیقی و مزین و ناقب و غیر ہم سے (جنہیں تھلید غالب کا بڑا دعویٰ ہے مگر سراسر غلط) میں غالب کا زیادہ مرتبہ شناس

ہوں۔ ان لوگوں نے ابھی عالم کو پہچانا ہی نہیں۔ عالم کے ساتھ میری یہ مخالفت ظاہری ان لوگوں کی تحسین ناشناس سے کہیں بھر ہے اور میری یہ مرتبہ شناسی بمقابلہ ان لوگوں کے، جو دراصل عالم کی مرتبہ شناسی کے اہل ہیں، ناقص و ناقص ہے۔

”مخزن“ میں میں نے ایک مضمون ”سرقہ، توار، توجہ“ کے عنوان سے شائع کرایا تھا، جس میں عالم کے چند اشعار معروف پر سرتے کا الزام لگایا گیا تھا اور یہ الزام بے جا نہ تھا اور بعض اشعار پر توجہ کا حکم لگا کر دلو انصاف دی تھی کہ جہاں ترجمہ بن چکے وہاں شاعر مستحق تحسین ہے۔ یہ مضمون اہل نظر کے نزدیک قابل قدر اور بعضی علی التحقیق ثابت ہوا۔ مگر افسوس ہے، جناب شوکت نے، جو مجھ سے پہلے سے بدعنوان تھے، اس مضمون کا جواب تو نہ دیا محض دل شکن الفاظ سے یاد کیا۔ سنی و شیعہ کا جھگڑا اور باغ فدک کا ذکر چھیڑ دیا۔ میرا نفس اور دیر کے مرثی کو نادل اور انسانوں کا مترادف ٹھہرایا اور آتش و تاج و اسیر کی نسبت یہ تحریر فرمایا کہ یہ لوگ فارسی سے بھی بالکل بے بہرہ تھے۔ حالاں کہ یہ امر ایسا ہی ہے جیسے کوئی دن کو رات کہہ دے۔ جناب شوکت کی مذہبی پھیپھڑاؤں سے لکھنؤ میں ایک برہمنی سیکل لگی اور اکثر حضرات نے اسی لب و لہجے میں جواب دینا چاہا اور میرے بعض سنی امداد بہت احباب نے بھی جواب لکھا چاہا مگر میں نے سب کے جوش کو خنثا کیا، کیوں کہ میں جناب ممدوح کو اپنا بزرگ جانتا ہوں۔ ان کے فرزند رشید جناب عدت میرٹھی سے مجھ سے دوستانہ مراسم ہیں۔

مرزا عالم کے حلق میرے مضامین سے جو برہمنی سیکل ہے اس

کے دو اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو باختر نفس مضمون، یعنی اعتراض صحیح ہیں یا نللہ، دوسرے باختر لب و لہجہ سو اس میں شک نہیں کہ میں نے عالم کے نقطہ انھیں اشعار پر اعتراضات وارد کیے ہیں جن میں فی الحقیقت خامیاں پائی جاتی ہیں، جن سے کوئی صاحب فن انکار نہیں کر سکتا۔ عالم کے ان اشعار پر میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا جو اردو کے لیے سرمایہ ناز ہیں۔ ان اعتراضات واقعی پر بکڑا اصول فن کی مخالفت کرتا ہے۔ ہاں، مجھ پر یہ الزام ضرور عائد ہوتا ہے کہ ایسے سخت لب و لہجہ میں اعتراض کرنا شوم ادب تھا۔ یہ شکایت میرے سر آنکھوں پر مگر کیا کروں، لکھنؤ کے چند ناظموں نے میرا نمٹس و خواہہ آفتی کے معاملے میں اس قدر میرا دل دکھایا کہ مجھے بھی وہی لب و لہجہ اختیار کرنا پڑا۔ یہ ناچاہت اندیش یہ کبھی تھے کہ ہمارے سوا اور کسی کے پاس الفاظ سخت کا ذخیرہ موجود ہی نہیں، آخر میں بھی منہ میں زبان رکھتا تھا۔ میں نہایت ادب سے اتنا اور عرض کروں گا کہ عالم منظور کی نسبت جو الفاظ سخت میرے قلم سے نکلے ہیں وہ ایسے دل دکھانے والے نہیں ہیں جیسے بارغ فوک کا ذکر یا میرا نمٹس و دیر کے سرائی کو تالوں یا انسانوں سے تشبیہ دینا، مگر اس پر بھی میں نے جناب شوکت کی تحریر کا جواب لکھنا یا لکھوانا مناسب نہیں جاتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ میں نے عالم منظور پر جو کچھ لکھا تھا، وہ محض مقامی ضرورتوں سے مجبور ہو کر لکھا، جس سے محض لکھنؤ کے چند ناظموں کی چشم نرائی مقصود تھی۔ اس بحث کو لکھنؤ اور دہلی کی چٹانچہ دیرینہ پر مہول کرنا قطعاً چاہی ہے۔ یہ بحث مطلقاً و مزید

عالم کے ایک معزز (ایس جی ہائیڈر)

عالم وغیرہم کی چشم نہائی کے لیے پھیری مگی تھی اور آج قسم ہو گئی۔ (مرزا یاس اور لکھنؤ)

دراصل مرزا یاس پر frustration اور انا کی کم زوریاں عالم آہنگی تھیں۔ ان کو تباہیوں نے ان کے حراج میں لاپہل پیدا کی تھی۔ بے شک وہ ایک خوددار اور قادر الکلام شاعر تھے۔ بے احتمالیوں کی وجہ سے وہ دوسروں کو اپنی برتری اور سر بلندی سے مغلوب کرنا چاہتے تھے۔ ”خن“ کے تذکرہ بالا مضمون کے آخر میں انہوں نے اعلان کیا تھا کہ اب وہ عالم کی مخالفت نہیں کریں گے۔ ان کا یہ دعوٰی کھوکھلا نکلا۔ راقم حروف کی نظر سے کئی ایسے رسالے گزرے ہیں جن میں مخالفت کا سلسلہ جاری رہا۔ ان میں ”قوس قزح“ اور ”طور“ قابل ذکر ہیں۔ یاس میں ایک کم زوری یہ بھی تھی کہ وہ اپنے مضامین دوسروں کے نام سے چھپوا کر گویا اپنا لوہا منوانا چاہتے تھے۔ موصوف نے ”چراغ خن“ (۱۹۱۵ء) میں عالم ہفتی کا ڈول ڈالا تھا اور عالم کی مخالفت میں حدود مضامین شائع کیے۔ ”چراغ خن“ کے تقریباً بیس سال کے بعد ایک کتابچہ ”عالم شکن“ ۱۹۳۳ء میں شائع کیا۔ کتابچے کی ابتدا میں ان کی تصویر بھی ہے، جس پر ”مرزا یگانہ پیکری صاحب آیات و ہدائی“ کے نیچے لکھا ہے:

"The Arch Artist - Poet of India"

یہ کتاب مرتب کر کے یاس کو لینے کے دسپے پڑے اور ادبی حلقوں میں ان کی شہرت بکروغ ہو گئی۔

اس وقت میرے پاس اردو کا ایک نادر الوجود رسالہ ”طور“ امرتسر، بابت فروری ۱۹۲۹ء ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ ذیل کے اشتہار سے ہو سکتا ہے جو صفحہ ۱۰۸ میں درج ہے:

”طور“ کا ”ماہ نو فیر“ نہایت آب و تاب سے ماہ مارچ میں شائع ہوگا۔ علامہ اقبال، شیخ عبدالقادر، مولانا سید سلیمان، پروفیسر محمود

شیرانی، مولانا ظفر علی خان، مولانا دہلوی، حضرت مولانا کھوسو، صفی کھوسو، مسٹر کھوسو، جوش طبع آبادی، قاتی بدایونی، امیر گنڈوی، دہشت کھوسو کے علاوہ اور بہت سے نام اور ادبا و شعرا کے نام تھے۔
ترین ادبی شاہ کار زحمت طوڑ ہوں گے۔

”طوڑ“ کے زیر نظر شمارے میں حامد حسین رسولی کا ایک مضمون ”مرزا عالم مرحوم اور مرزا یگانہ“ (صفحہ ۱۰۴ تا ۱۰۸) چمکا ہے۔ مضمون معلومات افزا ہے، اس لیے ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

مرزا عالم مرحوم اور مرزا یگانہ

”حب وطن“ کا شمار ان شریفانہ جذبات میں ہے جن کو ہر بھلا آدمی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہ کیا ہے کہ ترک وطن کیے ہوئے پشیم گزر گئیں، آج بھی لوگ اپنے نام کے ساتھ شیرانی، شیرانی، شرفانی، قدحاری، بخاری وغیرہ لکھتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں، مگر بمصادیقِ ظنہ چو ارزاں شود اسال سیدی شوم ایک صاحب، جو کل تک مرزا یاس عظیم آبادی تھے، آج مرزا یگانہ کھوسو ہو گئے ہیں اور ”حب وطن“ کا کیا ذکر، وطن کی نسبت سے اس درجے بیزاری کہ اس شخص کو بھی دھتکتا دیا جو عظیم آباد کی نسبت سے مشہور تھا۔ مگر آپ نے عظیم آباد کی سکونت ترک کر کے اب بلا استقلال لکھنؤ کو عزت بخشی ہے، لیکن عظیم آباد کے بھی کچھ حقوق تھے اور آپ کی جگہ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو وہ بھی عظیم آباد کی نسبت فراموش نہیں کر سکتا تھا، لیکن جب کسی مقصد خاص پر نظر ہو تو اس کے حصول کے لیے ہر اچھی سی اچھی بات سے زبردستی کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اور مقاصد جو کچھ بھی ہوں

ایک مقصد تو بہت واضح ہے، یعنی لکھنوی کہلا کر آپ اپنے اہل
زباں ہونے کا سہو پھونکتا چاہتے تھے اور اس طرح زبردستی اہل
زباں بن گئے۔ لیکن یہ متع کارِ اس نواح میں تو بھل نہیں سکتی۔
اس لیے بقول خود:

ہاے تو سدا مارے تا بجا مارے صاحب

پنجاب پر چما گئے۔

رسالہ ”طوطا“ ماہ جنوری ۱۹۲۹ء میں مرزا غالب کے اس شعر پر کہ:

فعل فریادی ہے کس کی شوئی تحریر کا

کاغذی ہے بھڑکن ہر جگہ تصویر کا

مرزا بکانتہ کی تنقید شائع ہوئی ہے اور طرزِ تحریر اس قدر بازاری اور
مرزا غالب پر اس نئی طرح لے دے کی گئی ہے کہ مجبوزا ایلٹیر
صاحب ”طوطا“ کو آئندہ کے لیے ذاتیات سے قحط رہنے کی
ہدایت کرنا پڑی ہے۔

میں ایک عرصے سے دیکھ رہا ہوں کہ لاہور کے رسائل میں مرزا
بکانتہ کی لکائی و بے ہمتی کا پردہ کھینچا گیا جا رہا ہے۔ ”تیرکب
خیال“ میں ”نظامِ روح“ پر ایک تنقید ادبِ آسوز کے فرضی نام
سے شائع ہوئی تھی۔ اس کی دو خصوصیتوں کی وجہ سے جاننے
والوں نے جان لیا کہ ”سر ایں تختہ ز جاہلیت۔“ اول تو طرز
تحریر اس قدر نامناسب اور سوزناک تھا جسے کوئی مہذب شخص برداشت
نہیں کر سکتا تھا، چنانچہ جنابِ ناشر ایم اے ۲۵ کو مجبوزا مضمون
نکار کے ساتھ ”تیرکب خیال“ کی چشم لٹائی کی ضرورت محسوس
ہوئی۔ اس اعجازِ تحریر ہی سے لوگوں نے پہچان لیا تھا کہ ادبِ
آسوز کے پردے میں کون بزرگ ہیں۔ دوسرے اس کارروائی

نے اور بھی بھاڑا پھوڑ دیا کہ باوجودے کہ تنقید میں کہیں سے مرزا یگانہ کے تذکرے کی ضرورت نہیں تھی۔ تاہم نہایت بلند آہنگی سے مرزا یگانہ کی میدان داریوں کا راجہ الاپا گیا تھا کہ فلاں مشاعرے میں اسنے اسنے استادوں کے مقابلے میں مرزا یگانہ نے یوں میدان سر کیا۔ فلاں مشاعرے سے یوں سرسبز واپس آئے۔ فلاں مشاعرے میں یوں لوگوں کے سر نیچے ہو گئے اور فتح میں مرزا یگانہ کو حاصل ہوئی۔

ایک مضمون ”قوس قزح“ میں بعنوان ”حقیقی شاعری اور مرزا یاس یگانہ کا حق“ کالج کے کسی طالب علم قمر پٹاوری کے نام سے شائع ہوا تھا، جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ حقیقی شاعر مرزا یگانہ ہیں اور بس، تعلیم یافتہ طبقے میں موجود شعرا میں سر اقبال اور شعراے ماضی قریب میں مرزا غالب کو جو عام حقولیت حاصل ہے، وہ محتاج بیان نہیں، لیکن اس تنقید میں مرزا یگانہ کا موازنہ سر اقبال اور غالب سے بھی کیا گیا تھا اور فضیلت مرزا یگانہ ہی کی دکھائی گئی تھی۔ اسی طرح ایک شعر نظیری کا بھی موازنہ میں لا کر نظیری سے بھی نمبر بڑھا دیا گیا۔ یہ مضمون بھی کوثر صاحب کے نام سے تھا، لیکن طرز تحریر سے اس میں بھی کسی پختہ کار کا ہاتھ معلوم ہوتا تھا۔ وہ بھی پٹاوری نہیں، بلکہ یوپی کے کسی شخص کا۔ یہ سب اس لیے برداشت کیا گیا کہ دکھا داری کے طریقے ہیں اور کھانے کھانے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے۔ آخر روٹی تو کسی طرح کھا کھائیں (اور آخر کار مضمون میں اس مقصد کی طرف بہت واضح اشارات کیے گئے تھے، یعنی ”جس طرح پہلے اہل کمال کم ہائی کی حالت میں گزر گئے، مرزا یاس

غالب کے ایک سحرش (یاں پتہ بگڑیں)

پکارت کھنکھائی جیسے پکارت روزگار اور دیگر اہل قلم کے ساتھ، جو اس وقت موجود ہیں، ایسی عدم توقیحی نہ ہونا چاہیے اور اہل ملک کو چاہیے کہ راسے، دسے، قدسے، سنے ہر طرح سے ان کی خدمت کریں) لیکن اب معاملہ حد سے بڑھ گیا ہے اور یہ ناقابل برداشت ہے کہ ان مشاہیر اساتذہ کی روچیں ستائی چا رہی ہیں جو اس دنیا سے گزر چکے ہیں۔

مرزا پکارت نے ایک شعر کی تنقید میں پورے چھ صفحے سیاہ کیے ہیں اور مولانا نظم طہا طہائی کی راسے کا بھی حوالہ دیا ہے۔ موصوف کی راسے اس شعر کی بابت یہ تھی کہ:

اس شعر میں مصنف کی غرض یہ تھی کہ نقشب فریادی مستی ہے اعتبار ہو گا اور بجی سبب ہے کاغذی بھین ہونے کا۔ شعر میں مستی ہے اعتبار کی گنجائش نہ ہو سکی کیوں کہ قافیہ سرام تھا اور شاعر کا مقصود تھا مطلع کہنا، تو مستی ہے اعتبار کے بدلے ”شوئی قرینہ“ کہہ دیا، مگر اس سے کوئی قرینہ مستی ہے اعتبار کے حذف پر نہیں پیدا ہوا۔ آخر خود ان کے حصہ پر لوگوں نے کہہ دیا کہ شعر بے معنی ہے۔

مرزا پکارت کو بھی شعر پر اگر کچھ اعتراض ہے تو زیادہ سے زیادہ وہی، جو حضرت قلم نے فرمایا۔ اس پر بھی چھ صفحے سیاہ کرنے کا مقصد بجز اس کے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ آپ خواہ مخواہ مرزا غالب کو برا بھلا کہنا چاہتے ہیں۔ بعض حضرات اس اصول کے پابند ہوتے ہیں کہ اپنی قابلیت اس وقت تک مسلم نہیں سمجھتے جب تک اپنے سے قابل تر لوگوں کو ناقابل نہ ثابت کر دیں۔ مرزا پکارت کا

بھی اسی اصول پر عمل ہوتا ہے۔

اس تنقید کے علاوہ آپ نے ایک رباعی میں فرمایا ہے کہ:

غالب کو بچکا بنا کے پھوڑا میں نے

(مخاورے کی بازاریت محتاج یہاں نہیں) اس اذعان کا مقصد بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ بے چارے نادانف دھوکے میں آجائیں کہ انور مرزا صاحب ایسے شاعر اور بچہ استاد ہیں کہ غالب جیسے نامی گرامی شاعر کے بچے اور حیز کے رکھ دیے۔

آزادانہ تنقید کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہا ہے۔ ایک طفل کتب بھی بڑے سے بڑے استاد کے کلام پر تنقید کا حق رکھتا ہے۔ یہ زمانہ تو خصوصیت سے آزادی کا زمانہ ہے۔ بقول شخصے کہ 'انا الحق کہو اور سولی نہ پاؤ'، لیکن آزادی اور بدتمیزی میں کوئی حد فاصل ضرور ہونی چاہیے۔ مرزا غالب انسان ہی تھے۔ جہاں انھوں نے ہزار ہا عمدہ شعر کہے ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی شعر میں تخیل کی رو میں دروسب الفاظ پر کافی غور نہ کر سکے ہوں اور کوئی جھجک رہ گئی ہو، لیکن اس سے ان کے شاعرانہ کمال میں کوئی نقص نہیں آتا اور ہر اہمے غیرے کو جس سے وہ اپنی حیات میں شاید مخاطب بھی گوارا نہ کرتے، یہ جنت ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ آج، جب کہ وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں، ان کو برا بھلا کہے۔ ایاز قدر خود شناس۔

ایک لڑکا اپنے باپ کے کندھے پر کھڑا ہو کر یہ دھواں کر سکتا ہے کہ میں قد میں اپنے باپ سے بھی بڑا ہوں، لیکن اس نالائق کو یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ اس گٹا بندی میں اس کے باپ کے قد کی بندی بھی شامل ہے۔ اسی طرح ہم چاہے جیسے بلند مرتبہ شاعر

اور نثار ہو جائیں۔ یہ حقیقت کسی طرح فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ہماری ساری قابلیت متکلفین اہل فن کی سعی و کوشش کی مرہونِ منت ہے، جنہوں نے اپنی ساری عمریں علم و ادب کی خدمت میں صرف کر دیں اور اس کارزار کو ہمارے لیے باغ و بہار بنا گئے۔ پھر یہ کیسی شامت ہے کہ ہم ان حضرات کے احسانات ایک قلم فراموش کر دیں اور بازاری آدمیوں کی طرح برا بھلا کہنے سے بھی دریغ نہ کریں۔ اگر کسی کی فطرت ہی ہنگامہ پسند واقع ہوئی ہے تو اسے اپنے معاصرین سے بھڑنا چاہیے تاکہ اہلِ کلام کا جواب پتھر سے ملے اور کچھ لطف بھی آئے۔ جس زمانے میں مرزا یگانہ پاس عظیم آبادی تھے اور حضراتِ لکھنؤ سے الجھ رہے تھے تو ظریف لکھنوی نے ایک شعر بے مصرع لگائے تھے جو بہت بڑ لطف میں۔ شعر تھا:

نہ مٹا ہے نہ مٹا جوہر والا نسبی

پاسِ مرکز بھی تو خاکِ ور سے خاند ہے

شعر میں ”جوہر والا نسبی“ اذعانے محض تھا، کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اس کی کو حضرت ظریف نے پورا کیا۔ ملاحظہ ہو (بند خلاف تہذیب تھا، لہذا کاٹ دیا گیا۔ طور) اور پچھلے چھاڑ کا یہی لطف ہے۔ اگر آپ کسی کو کچھ کہتے ہیں تو سننے کے لیے بھی تیار رہیے۔ ان حضرات کی نسبت کچھ کہنے کا کیا حرا جن کی ہڈیاں بھی قبر میں باقی نہ رہی ہوں گی۔

تھیں شعر کی بابت بھی مجھے کچھ عرض کرنا ہے اور جنابِ نظم طلباء کی کے تجربے اور پایۂ استادی کا احترام طوط رکھتے ہوئے اتماس ہے کہ مجھے اس سے اختلاف ہے کہ مرزا غالب ”مستی

بے اعتبار" کہتا چاہتے تھے لیکن قیدِ کافیہ سے مجبور ہو کر "شوئی تحریر" نظم کر گئے۔ انتخاب الفاظ میں حافظ علیہ الرحمۃ کی طرح مرزا غالب کا پایہ بھی بہت بلند ہے اور مرزا غالب کے ساتھ یہ سخت نا انصافی ہوگی، اگر کہہ دیا جائے کہ وہ کہتا کچھ چاہتے تھے، مگر قافیے سے مجبور ہو کر کچھ کہہ گئے، بلکہ ایک بے معنی لفظ بھرتی کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ اگر "مستی بے اعتبار" نظم بھی ہو سکتا تو غالب جیسا شعریت پسند شاعر اس موقع پر نظم کرنا کبھی نہ گوارا کرتا۔ اس لیے کہ "مستی بے اعتبار" شامل ہو کر ایک سیدھا سادہ شعر موزوں ضرور ہو جاتا، لیکن اس ایک لفظ "شوئی تحریر" سے پورے شعر میں جو شعریت اور تغزل پیدا ہو گیا ہے وہ ہرگز پیدا نہ ہو سکتا۔ افسوس ہے کہ جو لفظ پورے شعر کی جان ہے، اسی کو بھرتی کا اور برے ہیئت بتایا جاتا ہے۔ مرزا یگانہ ایسی شکایت کو جذبہٴ معذرت کے منافی سمجھتے ہیں۔ یہ بھی انتہائی زبردستی ہے۔ مرزا غالب نے "شوئی تحریر" نظم کر کے ایسے اعتراضات کا سبب کر دیا ہے۔ اگر صاف صاف "مستی بے اعتبار" کی شکایت ہوتی تو شاید ایسا اعتراض ہو سکتا، لیکن مرزا نے "شوئی تحریر" سے نقاش کی معشوقیت کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اب اگر کچھ شکوہ و شکایت ہے تو اس کی نوعیت وہ نہیں ہے جو عہد و معبود کے درمیان ہوتی ہے، بلکہ یہ عاشق و معشوق کے درمیان کے وہ راز و نیاز ہیں جن میں کسی غیر کو مداخلت کا حق نہیں۔ اپنے دعوے کو مزید تقویت دینے کے لیے مرزا پچاٹہ نے مرزا غالب کے ایک اور شعر کا حوالہ دیا ہے۔ یعنی:

دعویٰ اپنی جب اس شکل سے گزری غالب

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
لیکن شعر و شاعری سے ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہ
شاعرانہ خوشیاں ہیں جن پر سبیدگی سے بحث کرنا بالکل غیر ضروری
ہے۔ اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ جن شعرا نے بادشاہوں کی
شان میں قصیدے نہیں لکھے ان کی قناعت اور توکل قابلِ تعریف
ہے، لیکن تمہا مرزا غالب کیوں سود و انعام میں اور ان کے قصائد
کو کیوں بھٹکتی کہا جاتا ہے۔ جب کہ ان کے غش رو بڑے بڑے
پائے کے شعرا بھی اس سے نہ بچ سکے:

لالہ سائر کبیر و زمزم مست و برہ نام فسق
اور پھر خصوصیت کے ساتھ ملکہ و کٹوریا اور اس سے بھی گزر کر
دائسراے کی شان میں قصیدہ گوئی کیوں موجبِ ملامت ہو، جب
کہ دوسروں نے بھی بادشاہوں، وزیروں اور دیگر امراے و دربار کی
شان میں قصائد کہے ہیں۔ تنقید میں ایک موقع پر مرزا یگانہ نے
یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ:

جس کے (مرزا غالب کے) کلام کو بعض غیر ذلتے دار
اشخاص صحیفہ آسمانی کہہ دینے میں تامل نہ کریں۔

غالب مرزا یگانہ "ذلتے دار اشخاص" میں صرف اپنا شمار کرتے ہیں،
ورنہ جہاں تک دیکھا گیا ہے ہر شخص کو، جسے شعر و شاعری سے
کچھ بھی دلچسپی ہے، مرزا غالب کے کلام کے ساتھ ایک عام شناسائی
ہے، اس میں خواء پرانے تعلیم یافتہ ہوں یا نہ ہوں۔ دیوانِ غالب
کے ایڈیشن پر ایڈیشن اور شرحوں پر شرحیں چھتی جا رہی ہیں اور
سب سے بڑھ کر اسے وہ عزت حاصل ہوئی جو ہندوستان میں
کسی اردو کتاب کو نصیب نہیں ہوئی، یعنی 'مرتبہ چٹائی' کے نام

سے دیوان غالب ہاتھ شائع ہوا۔ جس کی قیمت گو ایک سو دس روپے رکھی گئی۔ تاہم تین سو جلدیں جو تیار ہوئیں، ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئیں، اب ادنیٰ قسم کی جلدیں سترہ روپے میں فروخت ہو رہی ہیں۔

مخالفین کو اس عام مقبولیت کی علت معلوم کرنا چاہیے۔ کیا وجہ یہ نہیں ہے کہ کلام غالب میں جان ہے۔ اس لیے جب تک دنیا میں شعر و شاعری کا چرچا باقی رہے گا، کلام غالب زندہ رہے گا اور اس کے سانس کی تپشیں رہے گی، بلکہ جیسے جیسے مذاق سدھرتا جائے گا، اس کی مانگ اور بڑھتی جائے گی۔

برخلاف انہیں ایک بے جان دیوان کا نام چاہیے 'آیات و ہدائی' رکھ دیجیے، چاہے اس سے بھی کوئی شان و نام؛ خواہ آرٹ بھر پر چھپوایے، خواہ سنہری جلد بندھوایے؛ خواہ کوئی شیرازی صاحب دیباچہ لکھیں، خواہ ہدیہ پیکٹڈ کرنے میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیجیے؛ نہ کوئی آج پوچھتا ہے نہ کل کے لیے کوئی امید! غالب جب زندہ تھا جب بھی غالب تھا، آج بھی غالب ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ غالب رہے گا۔

قبول خاطر و لطف خن خداوار است

اگر کسی کو اس میں محبوب ہی دکھائی دیتے ہیں تو چشمہ آفتاب را چہ گناہ۔ (عابد حسین رسولوی)



حواشی

۱۵۰ چترنگ کے اس مضمون کا سلسلہ جواب سید احمد حسن نے دیو جی "میزان" ماہیت جنوری ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا تھا۔

۱۵۱ بھڑوہنسہ شرح احمد حسن حرکت میراجی اردو کے ایک کاہر انکلام شاعر، صاحب طرز نثر نگار اور ادبی پسے کے صحافی تھے۔ بچے دار اخبار "شکوہ بند" اور "مظنی بند" میرٹھ کے ایڈیٹر تھے۔ اپنی دونوں اخباروں کا ذکر اختلاف دار کی کتاب "بھڑوہنسہ" مطبوعہ جون ۱۸۸۸ء میں ملتا ہے، حرکت میراجی نے ستمبر ۱۸۹۵ء میں ایک ماہ نامہ "پردان" کے نام سے جاری کیا تھا۔ اس کی تفصیلات راقم حروف کے مضمون "پردان اور اقبال" مطبوعہ "ہماری زبان" دہلی، ۸ مارچ ۱۹۹۲ء میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ حرکت نے میرٹھ میں ایک مضامین کا نام کیا تھا۔ اس کا نام "معاشرہ نوپسندی" تھا اور یہ ہر سہیٹے ہوا کرتا تھا۔ حرکت نے مرزا بیول، تصویر قاریابی اور غالب کے درجہ ان اردو کی طرحیں بھی لکھی تھیں۔ حرکت ایک تعلیم یافتہ، روشن خیال شخص اور کھیلے دہن کے مالک تھے۔ سرسند کے حامیوں میں بیٹیں بیٹیں تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۲۲ء میں ہوا۔

۱۵۲ محمد یحییٰ قاسمی: اردو کے مشہور ناقد اور صحافی تھے۔ ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے اور ۳۸ سال کی عمر میں ۱۹۵۰ء میں انتقال کر گئے۔ ابتدا میں جوائی ۱۹۲۳ء میں مشہور رسالے "تحریرک خیال" لاہور کے اسٹینٹ ایڈیٹر ہوئے تھے۔ اس کے ابتدائی شماروں میں فلسفہ کلام اقبال پر کی مضمون لکھے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں امرنگھ کاٹیج سری نگر کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں مولوی غلام حسین جی ناظم تعلیمات اور جعفر علی خان آرٹر کھسروی وزیر تعلیم تھے۔



غالب کی اردو نثر

اور

دوسرے مضامین

مولانا حامد حسن قادری

مولانا حامد حسن قادری ہمارے ادب کا ایک بہت بڑا نام ہے۔ انھوں نے نصف صدی سے زیادہ عرصے تک اردو زبان و ادب کی جو خدمت کی ہے، وہ ہماری ادبی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ وہ ایک وقت بلند پایہ محقق، نقاد، ادبی مورخ، شاعر، تاریخ گو، مترجم اور مکتوب نگار تھے۔ ان کی ادبی یادگاروں میں ”داستان تاریخ اردو“ اپنی نوعیت کی بے مثال کتاب ہے۔ اردو نثر کی یہ تاریخ بلا اردو کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

غالب بھی مولانا کی دلچسپی کا ایک خاص موضوع ہے۔ لیکن اس موضوع سے متعلق ان کی تحریریں مختلف کتابوں اور رسالوں میں اکھری ہوئی ہیں اور کبھی کتابی صورت میں یک جہتیں کی گئیں۔ ادارہ یادگار غالب کی درخواست پر مولانا کے فرزندہ اکمل خالد حسن قادری نے ان تحریروں کو مرتب فرما دیا ہے اور یہ پہلی بار کتابی صورت میں شائع ہو رہی ہیں۔

پہلے صفحات: ۲۰۰ ☆ قیمت: ایک سو پچاس روپے

ادارہ یادگار غالب

کراچی

مقالاتِ ممتاز

ممتاز دانشور ڈاکٹر ممتاز حسن کے مقالات کا مجموعہ

مرتبہ

شانِ الحقِ حقی

اردو ادب، عالمی ادب، تعلیم و ثقافت اور اقبالیات کے موضوع پر

چھپالیس مقالات کا مجموعہ۔ اس میں قائد اعظم، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی

خان، ملک اشعر ابھارا اور بعض دیگر کا برکے شخصی خاکے بھی شامل ہیں۔

☆ صفحات ۴۷۲ ☆ قیمت ایک سو پچاس روپے

ادارۃ یادگار غالب

کراچی۔ ۷۳۶۰۰

غالبیات کے چند فراموش شدہ گوشے

اردو کے پہلی تحقیق میں ڈاکٹر اکبر حیدری کا کام سپار اور مقدار دونوں کے اعتبار سے مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ گزشتہ چار دہائیوں سے جس طرح اردو زبان و ادب کے مختلف گوشوں پر وہ تحقیق و سد ہے، اس کی مثالیں کم کم ملتی ہیں۔

غالب کے حوالے سے ڈاکٹر حیدری نے درجنوں مقالات لکھے ہیں جو مختلف علمی جریدوں میں نکھرے ہوئے ہیں یا تاحال غیر منظر پر ہیں۔ ان کی افادیت کے قوش نظر اور بیا دگار غالب کی طرف سے ان سے درخواست کی گئی کہ وہ ان مقالات کو کتابی صورت میں یکجا کر دیں تو ان سے استفادے کا دائرہ وسیع ہوگا۔ اس گزارش کے جواب میں انھوں نے جو مضامین ارسال فرمائے، انھیں مندرجہ ذیل دو مجموعوں کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے:

(۱) نواور غالب

(۲) غالبیات کے چند فراموش شدہ گوشے

ان دونوں مجموعوں میں حیات و آثار غالب اور معاصرین و حلقہ مقربین غالب کے بارے میں جو معلومات ملتی ہیں، وہ شاید ہی کسی دوسری جگہ دستیاب ہوں۔ امید ہے ان دونوں کتابوں کی اشاعت سے غالب پر حریر کام کرنے کی راہ ہموار ہوگی۔

